مسلمان عورت
مولانا ابوالکلام آزادؒ
المکتبۃ الاثریہ۔ سانگلہ ہل ضلع شیخوپورہ
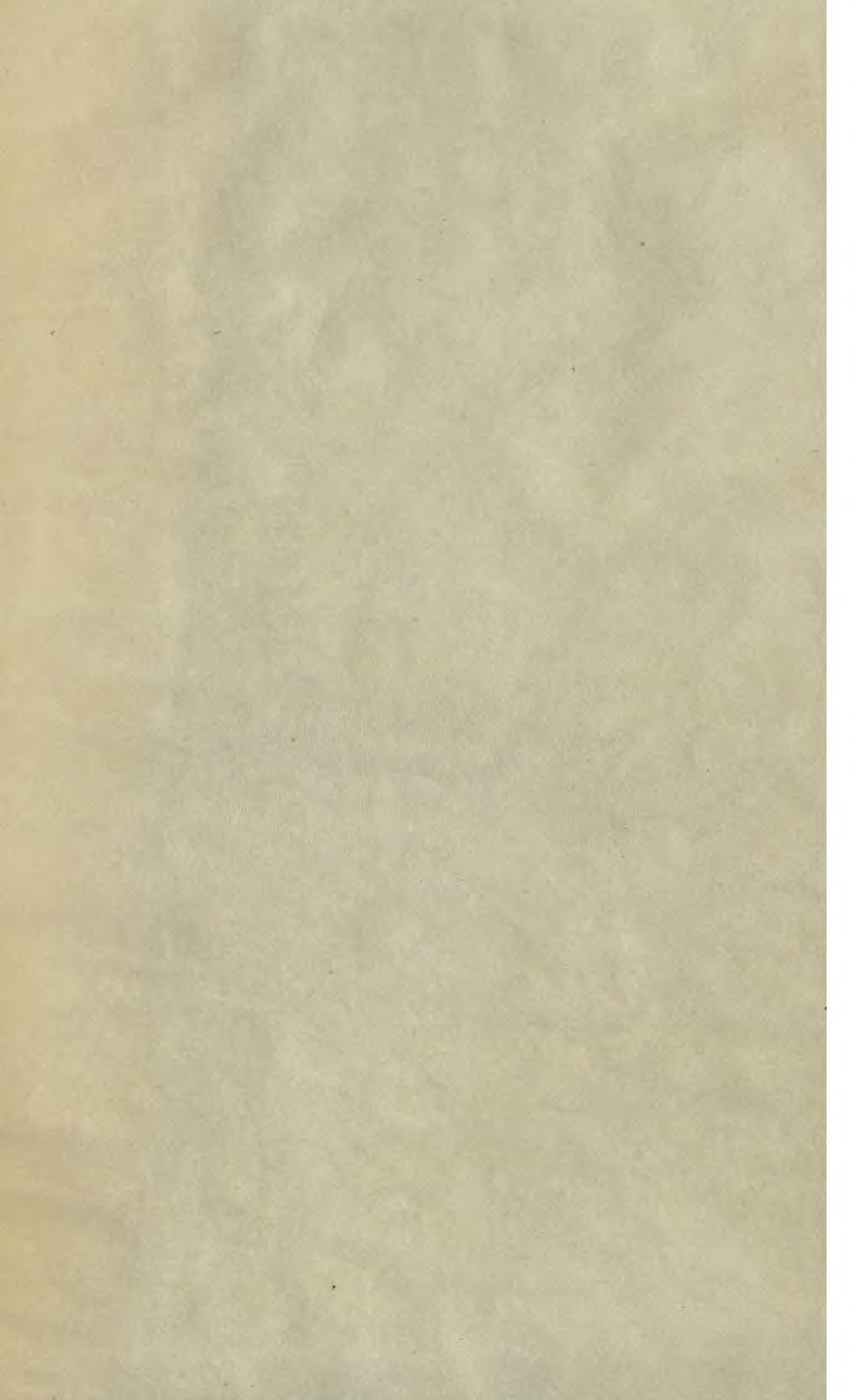
مسلمان عورت

تالیف و تصنیف

فرید وجدی آفندی

ترجمہ

ابوالکلام آزاد

ناشر

المکتبۃ الاثریہ

جامع مسجد باغ والی

سانگلہ ہل ضلع شیخوپورہ

۱۔ نام کتاب — مسلمان عورت
مصنف — فرید وجدی آفندی
ترجمہ — ابوالکلام آزاد

۲۔ نام کتاب — اللؤلؤ والمرجان فی تکلم المرأۃ بآیات القرآن
مصنف — مولانا ابوالقاسم رحمہ اللہ العالم بنارسی
طابع — المکتبۃ الاثریہ جامع اہلحدیث باغ والی سانگلہ ہل شیخوپورہ
تعداد — ایک ہزار
قیمت — قیمت مجلد بارہ روپے
کتابت — خالد فاروقی حضرت کیلیانوالہ۔ ضلع گوجرانوالہ۔

فہرس

دیباچہ

پیشِ نظر کتاب فرید وجدی کی عربی تصنیف "المرأۃ المسلمہ" کا اردو ترجمہ ہے۔ جو اولین ثمر ہے مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی مساعی کا اور تصنیفی صلاحیتوں کا۔ اس کو ترجمہ ہم واقعیت کے اعتبار سے کہتے ہیں۔ ورنہ اس کو فرید وجدی کی کتاب کا اُردو ایڈیشن کہنا چاہیئے۔ یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ عالمِ اسلامی نے بالعموم اور مصر نے خصوصیت سے، جس سرعت سے تہذیبِ مغربی کے سانچوں میں اپنے افکار و عمل کو ڈھالا ہے اس کی نظیر آپ کو دوسری جگہ نہیں ملے گی یوں تو یہ فتنہ عالم آشوب ہے مگر مصر اور اسلامی دنیا نے تو پوٹا ہی ٹیک دیا ہے۔

اس مرعوبیت اور احساسِ کمتری کو دور کرنے کے لئے مصر ہی کے ایک عالم کو اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا کہ وہ اس طلسم کو توڑنے میں کامیاب رہے فاضل موصوف نے تہذیبِ جدیدہ کے اس خاص پہلو پر کہ عورت کے قدرتی فرائض تدبیرِ منزل کے فلسفہ کے منافی نہیں ہیں بہ چشم کشا بحث فرمائی ہے۔ اصل میں مغربی تغلب و استیلاء نے ذہنوں کو اس درجہ مفلوج کر دیا ہے کہ اب اپنی ہر ادا سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ اور ساحرانِ فرنگ کی ہر چیز محبوب یہ محکومی و غلامی کا لازمی نتیجہ ہے۔ غالب اقوام کی سیف و تیغ سے جہاں سر قلم ہوتے ہیں وہاں ذہن و فکر بھی مجروح ہوتے ہیں اور بہت کم نفوس ایسے ہوتے ہیں جو ذہنی شکست سے اپنے افکار و خیالات کو محفوظ رکھ سکیں۔

علامہ ممدوح ان چند لوگوں میں سے ایک ہیں جو چٹان کی طرح اپنے مسلک پر قائم رہے۔

قاسم امین نے جب "تحریر المرأۃ" اور "المرأۃ الجدیدۃ" کے نام سے دو کتابیں شائع کیں تو مصر میں ہلچل مچ گئی نوجوان طبقہ خصوصیت سے ان خیالات سے متاثر ہوا اور اب اس موضوع پر کھلے بندوں تبادلِ خیالات ہونے لگا کہ اپنے مجلسی نظام کو جدید قدروں اور معیاروں پر استوار کیا جائے۔ کئی لوگوں نے ان کتابوں کا جواب لکھا لیکن ان میں یہ جامعیت نہ تھی۔ اور ان کی حیثیت دفاع کی تھی۔ علامہ فرید وجدی تڑپ کر اٹھے اور فلسفہ

حکمت کے دلائل کا انبار لگادیا۔ انھوں نے ثابت کیا کہ قصر اسلامی کی بنیادیں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں پر قائم ہیں۔ اس لئے ترمیم و اصلاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا دلائل کی تفصیل اور نوعیت تو آپ اصل کتاب میں دیکھیں گے جو چیز قابلِ قدر ہے وہ کتاب کا طریق اسلوب ہے کہ ہر ممکن پہلو سے موضوع بحث پر روشنی ڈالی ہے اور کہیں رکیک دپا افتادہ دلائل کو پیش نہیں کیا

مندرجات کی مختصر فہرست یہ ہے:۔

۱۔ عورت کیا ہے؟ یعنی اپنی فطری مجبوریوں اور جسمانی تقاضوں کے اعتبار سے اس میں اور مرد میں کیا فرق ہے؟

۲۔ عورت کے فطری اور قدرتی فرائض کیا ہیں؟

۳۔ کیا مرد اور عورت جسمانی طاقت میں مساوی ہیں؟

۴۔ کیا عورتیں عملی جدو جہد میں مردوں کا ساتھ کامیابی سے دے سکتی ہیں؟

۵۔ کیا پردہ عورت کی فطری صلاحیتوں کی تربیت کا قدرتی ذریعہ ہے؟

۶۔ کیا پردہ عورتوں کے لئے غلامی کی علامت ہے؟ اور کیا یہ حقیقی ترقی کا منافی ہے؟

۷۔ کیا موجودہ دور کی عورتیں کامل عورتیں ہیں؟

۸۔ مسلمان عورتوں کا طریق تعلیم کیا ہے؟

موصوف نے ان تمام مضامین پر فلسفۂ علم الحیات، نفسیات، عمرانیات اور تاریخی روشنی میں بحث کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ عورت کی تمام ساعی کے لئے اصلی میدان گھر ہے۔ اس کے قلب و ذہن اور حسن و جمال کی تمام رعنائیاں اس لئے ہیں تاکہ تیرہ و تار گھروں میں اس کی وجہ سے روشنی پیدا ہو، یہ رونق کاشانہ ہو۔ شمع محفل نہ ہو۔ تاریخ کے اوراق آپ کے سامنے ہیں۔ جب کبھی یہ دہلیز امن و سکون سے باہر نکلی ہے۔ اور زندگی کی پرشور وادیوں میں اس نے قدم رکھا ہے، مرد کے مصائب میں اضافہ ہی ہوا ہے بلکہ تباہی و بربادی کے تمام واقعات میں بالکل صاف طور پر آپ کو یہ نظر آئے گا کہ اس میں عورت کا حسین ہاتھ کارفرما ہے۔ کتنے بڑے بڑے تمدن محض اس وجہ سے مٹے ہیں کہ اس میں زندگی کے ان دو انسانوں میں ترتیب ملحوظ نہیں رکھی گئی۔ یعنی رزم و بزم کی سرحدوں کو ملا دیا گیا۔ وہ عورت جو اس لئے پیدا کی گئی تھی کہ ماں بنے اور امومت کے شرف سے بہرہ ور ہو۔ اس کو ہوس کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ اس صورتِ حال

کو موجودہ دور کا پڑھا لکھا اگر بیوقوف انسان جس قدر جلد محسوس کرے یہ اس کے لئے بہتر ہے ورنہ فطرت اپنا فرض پورا کرے گی اور ایسے تمدن کو تہ و بالا کر دے گی جس کی بنیاد فطرت پر نہیں بلکہ ادنٰے درجے کی خواہشوں کی تکمیل پر قائم ہے۔

(مولانا) محمد حنیف ندوی

مُقدّمہ

در رہِ عشق نہ شد کس بہ یقین محرمِ راز

ہر کسے بر حسبِ فہم گمانے دارد

تعلیم اور خیالات کے اختلاف نے آج کل ہندوستان میں دو گروہ پیدا کردیئے ہیں۔ قدیم تعلیم کی یادگار اور نئی تعلیم کا تربیت یافتہ۔ تقریباً یہی حال مصر کا ہے۔ نئے اور پرانے گروہ میں جو حدِ فاصل یہاں نظر آتی ہے وہاں بھی قائم ہے۔ لیکن اس مماثلت کے ساتھ بڑا فرق یہ ہے کہ یہاں نئی تعلیم نے ذریعۂ ملازمت ہونے کے ساتھ اور کوئی فائدہ قوم اور لٹریچر کو نہیں پہنچایا۔ لیکن مصر میں نئی تعلیم نے ذریعۂ ملازمت ہونے کے ساتھ نسبتاً عمدہ نتائج پیدا کیے ہیں نئے گروہ میں علمی مذاق پیدا ہو چلا ہے جو تصنیفات آج عربی لٹریچر کا مایۂ ناز سمجھی جاتی ہیں تقریباً تمام تر نئے گروہ کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں نیا گروہ اگرچہ ضروریاتِ زمانہ سے باخبر ہے اور یورپ کے قدم بقدم چلنا چاہتا ہے۔ مگر چونکہ اپنی حالت کی بے خبری اور تعلیم کے نقص نے امتیاز کا صحیح مادہ سلب کردیا ہے۔ اس لئے اس امر کی قدرت نہیں رکھتا کہ حسن و قبح میں تمیز کر سکے۔ برخلاف اس کے مصر کا نیا گروہ یورپ کی ہر ادا کو شیفتگی کے ساتھ دیکھتا ہے مگر نقادانہ نگاہ بھی ڈالتا ہے جو نئے مباحث یورپ کی تقلید نے پیدا کردیئے ہیں وہ ہندوستان کی طرح مصر میں بھی پیش ہوتے رہتے ہیں مگر موافقانہ یا مخالفانہ جو کچھ اس پر لکھا جاتا ہے وہ یہاں کی نسبت زیادہ شائستہ اور مدلّل ہوتا ہے۔

نئے مباحث میں ایک بڑی بحث عورتوں کی آزادی یا پردہ کی ہے۔ ہندوستان کی طرح مصر میں بھی پچھلے دنوں یہ بحث چھڑ گئی۔ مصر کی تعلیم یافتہ سوسائٹی کے ایک ذی اثر ممبر مسٹر قاسم امین بک ہیں۔ جو کسی زمانہ میں پردہ کے مؤید تھے اور یورپ کی موجودہ آزادی کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ فرنچ میں ایک رسالہ بھی پردۂ اسلامی کی تائید پر لکھا تھا جس نے فرانس میں کچھ دنوں کے لئے ہل چل مچادی تھی۔ لیکن پچھلے دنوں .... ان کی رائے میں

یکایک انقلاب پیدا ہو گیا اور یورپ کی آزادی کی جگہ پردہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ چونکہ گزشتہ غلطی کا کفارہ ضروری تھا اس لئے پردہ کی مخالفت اور آزادی نسواں کی ضرورت پر یکے بعد دیگرے دو رسالے لکھ کر شائع کیے جن میں سے پہلے رسالے کا نام "تحریر المراۃ" ہے اور دوسرے کا نام "المراۃ الجدیدہ" ہے۔ ان دو رسالوں نے اہلِ مصر کو نئے سرے سے اس مسئلہ پر متوجہ کر دیا۔ قاسم امین بک کی تردید میں معمولی مضامین کے علاوہ پانچ رسالے علی الترتیب لکھے گئے ہیں جن میں سے ایک رسالہ بیروت کے کسی عالم کی تصنیف ہے اور چار رسالے مصر کے تعلیم یافتہ اشخاص کے قلموں سے نکلے ہیں۔ انہی رسالوں میں ایک رسالہ "المراۃ المسلمہ" بھی ہے جو مصر کے مشہور مصنف فرید وجدی کی تصنیف ہے۔ اس رسالے کے ذریعے ہم اُردو خوان پبلک کو اس کے قابلِ قدر مباحث سے واقف کرنا چاہتے ہیں جس سے ایک طرف تو آزادیٔ نسواں کے مسئلہ پر روشنی پڑے گی اور دوسری طرف اس امر کا بھی اندازہ ہو جائے گا کہ مصر کا نیا علمی مذاق ہندوستان کے مذاق سے کس درجہ مختلف ہے۔

اہم خصوصیتیں:

ہندوستان میں تقریباً بیس برس سے اس مسئلہ پر خامہ فرسائی ہو رہی ہے اور ایک خاص لٹریچر اس موضوع پر تیار ہو گیا ہے۔ لیکن اس تمام دفتر کا یہ حال ہے کہ نئے گروہ نے جس قدر پردہ اور تقید کی خرابیاں دکھائی ہیں وہ خود نہیں دکھائی ہیں بلکہ یورپ کے اثر میں محیط ہو کر دکھائی ہیں۔ یورپ کے رُعب نے اس طرح انہیں دم بخود کر دیا ہے کہ ایک لفظ بھی اس کی مخالفت میں نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے وہ یورپ ہی کی آواز ہے جو "ہیٹ" کی جگہ "طرپوش" سے چھپے ہوئے سروں سے نکلتی ہے جن لوگوں نے پردہ کی تائید میں رسالے لکھے ہیں ان میں بڑی جماعت قدیم تعلیم یافتہ لوگوں کی ہے۔ چونکہ ان لوگوں کی نظروں سے یورپ کا حال پوشیدہ ہے اس لئے جو کچھ لکھتے ہیں مذہب کے بل پر لکھتے ہیں اور مذہب ہی ایک ایسی چیز ہے جس کا جادو نئے گروہ پر کارگر نہیں ہو سکتا

فرید وجدی چونکہ یورپ کی متعدد زبانوں سے واقفیت رکھتا ہے اور خود تعلیم یافتہ سوسائٹی کا ایک فاضل ممبر ہے اس لئے اس نے جو کچھ لکھا ہے محض یورپ کے اقوال و حالات کو پیش نظر رکھ کر لکھا ہے۔ اس بنا پر ظاہر ہے کہ "المراۃ المسلمہ" جس قدر نئے گروہ پر اثر ڈال سکتی ہے۔ ہمارے یہاں کی مذہبی تحریروں سے اس قدر توقع نہیں ہو سکتی۔

عورتوں کی آزادی کا مسئلہ درحقیقت ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ یورپ کا طرزِ عمل اگرچہ اس کی تائید میں ہے لیکن جمہور کی آواز نہایت سختی سے اس کی مخالف ہے۔ ایک بڑی باسیک بین جماعت موجود ہے جو اس آزادی

کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اس خطرناک زمانہ کی یقین کے ساتھ منتظر ہے جب اس آزادی کا لازمی نتیجہ تمدن اور معاشرت کی بنیادیں متزلزل کردے گا۔ ہمارے یہاں کے مخالفینِ پردہ یورپ کے طرزِ عمل کو تو شوق کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں لیکن چونکہ نظریں کوتاہ اور معلومات محدود ہیں اس لئے مخالف جماعت کی رائوں سے واقفیت نہیں رکھتے۔ پردہ کے مویدین یورپ کی زبانوں اور حالات سے محض بے خبر ہیں۔ اس لئے ان کی رائے بھی اس میدان میں سبقت نہیں لے جا سکتی۔ فرید وجدی چونکہ یورپ کے اقوال و حالات پر وسیع نظر رکھتا ہے۔ اس لئے اس نے اول ان تمام لوگوں کی رائیں ڈھونڈ کر جمع کی ہیں اور دکھلایا ہے کہ جس ملک کے طرزِ عمل پر فریفتہ ہو کر مصلحت اور تمدنی فوائد سے چشم پوشی کرتے ہو خود اس ملک کے اہل الرائے اور موجودہ مدنیت کے مجدد اس طرزِ عمل کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ پھر مشاہیر علمائے یورپ کے خیالات پیش کر کے ہمدردانہ لہجہ میں نصیحت کی ہے کہ محض ظاہری آزادی کے کرشمہ پر بےخود نہ ہو جایئے کیونکہ جن نتائج کی بنا پر آزادی کا شور مچاتے ہو وہ خبر سے یورپ میں بھی مفقود ہیں۔

اس سرسری رائے کے بعد اب ہم المراۃ المسلمہ کے اہم مباحث کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

عورتوں کی آزادی کی حمایت میں اس وقت تک جس قدر ذخیرہ جمع ہو چکا ہے اس میں اہم اور قابلِ بحث صرف تین مسئلے ہیں۔ ان کے علاوہ اور جتنی باتیں کی جاتی ہیں وہ دراصل انہی تین مسئلوں کی شرح و تفسیر میں داخل ہیں۔

(الف) انسان فطرتاً آزاد ہے اور اس فطری آزادی میں کوئی خصوصیت ثابت نہیں ہوتی۔ پھر وہ کون سا معیار ہے جس کی بنا پر انسانوں کا ایک گروہ تو اس آزادی سے فائدہ اٹھائے اور دوسرا گروہ محروم رکھا جائے۔

(ب) جب انسانی قویٰ کی نشو و نما تمدنی اور شائستہ زندگی کے لئے ضروری ہے تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ عورتیں اس عقلی نشو و نما سے محروم رکھی جائیں؟ مردوں نے علوم و فنون، انتظامِ سیاست اور دنیا کے تمام تمدنی مشاغل اپنے لئے مخصوص کر لئے ہیں اور عورتیں اس دنیا سے بالکل الگ رکھی گئی ہیں۔ اول تو انہیں تعلیم دی ہی نہیں جاتی اور اگر کوئی کرم دل اس کے مظلومانہ سال پر متاسف ہوتا بھی ہے تو صرف معمولی تعلیم ان کے لئے کافی خیال کی جاتی ہے۔ کیا وہ انسان نہیں ہیں؟ کیا ان میں دماغی قوتیں موجود نہیں ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو کیا یہ صریح ظلم نہیں ہے کہ علمی دنیا کے شائستہ مشاغل سے انہیں یک لخت محروم کر دیا جائے۔

۲۔ اس وقت تک عورتیں علمی لذت سے محض ناآشنا ہیں اور یہ تمام تمدنی میدان کل کا کل مردوں کے قبضہ میں رہا۔ اس لئے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ان میں مردوں کی طرح دماغی ترقی کی صلاحیت نہیں ہے کیونکہ اس

وقت تک انہیں ترقی کا موقع ہی کب دیا گیا؟ آج علم تشریح اور فزیالوجی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ مرد و عورت دماغی قوتوں میں بالکل برابر ہیں اور ثبوت کے ساتھ انہیں عام آزادی بھی دے دی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ میں کوئی کام ایسا نہیں ہے جسے مردوں کی طرح مغربی عورتیں انجام نہ دیتی ہوں۔ ڈاکٹر عورتیں ہیں پروفیسر عورتیں ہیں اور لیکچرار عورتیں ہیں غرضیکہ ہر میدان میں مردوں کے برابر ترقی کر رہی ہیں۔ یہ نظیر بھی بتلا رہی ہے کہ اگر عورتوں کو مردوں کے تسلّط سے نجات ملے اور اعلیٰ تعلیم سے مردوں کی طرح فائدہ اٹھائیں تو وہ کسی چیز میں مردوں سے کم رتبہ ثابت نہیں ہو سکتیں۔

۳۔ مشرق نے جو ظالمانہ رائے عورتوں کے متعلّق زمانۂ جاہلیت میں قائم کی تھی، اس وقت تک اس پر قائم ہے۔ مسلمان عام طور پر عورتوں کو ناقصات العقل والدّین اور فتنہ و فساد کی جڑ سمجھتے ہیں۔ برخلاف اس کے یورپ عورتوں کی غیر معمولی عزّت اور احترام کرتا ہے اور مردوں سے کسی امر میں کم نہیں سمجھتا۔

یہ تین باتیں وہ ہیں جو آج مصر و ہندوستان میں پردہ کا ہر مخالف زور شور سے پیش کرتا ہے، اور ان کی تشریح و تفسیر میں عجیب عجیب نکتہ آفرینیاں کی جاتی ہیں۔ ان سے فرید وجدی نے المرأۃ المسلمہ میں انہی تین مسئلوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور ان کے متعدد ٹکڑے کر کے تیرہ فصلوں میں الگ الگ بحث کی ہے۔ ان فصلوں میں اہم مباحث یہ ہیں:-

۱۔ عورت کیا ہے؟

۲۔ عورت کے قدرتی فرائض کیا ہیں؟

۳۔ کیا مرد اور عورت جسمانی طاقت میں مساوی ہیں؟

۴۔ کیا عورتیں عملی دنیا میں مردوں کے ساتھ شریک ہو سکتی ہیں؟

۵۔ کیا عورت کو مردوں سے پردہ کرنا چاہیئے؟

۶۔ کیا پردہ عورتوں کے لئے غلامی کی علامت ہے؟ اور کیا آزادی کا منافی ہے؟

۷۔ کیا پردہ عورتوں کی ترقی و کمال کا مانع ہے؟

۸۔ کیا پردہ کا عام اثر زائل ہو سکتا ہے؟

۹۔ کیا موجودہ مادّی مدنیّت کی عورتیں کامل عورتیں ہیں؟

۱۰۔ مسلمان عورتوں کی تعلیم کا احسن طریقہ کیا ہے؟

ابوالکلام آزاد

عورت کے قدرتی فرائض

قدرت نے مخلوقات کو مختلف جنسوں اور مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے اور ہر گروہ کے خاص خاص فرائض اور خاص خاص وظائف قرار دیئے ہیں۔ ان تمام فرائض کی انجام دہی کے لئے چونکہ ایک ہی قسم کی جسمانی حالت اور دماغی قابلیت کافی نہ تھی۔ اس لئے جس گروہ کے متعلق جو کام کیا گیا اسی کے موافق اس کو دماغی اور جسمانی قابلیت عطا کی گئی۔ فرائض کے اختلاف کے ساتھ ضروریات زندگی کا بھی مختلف ہونا ضروری تھا۔ اس لیے ہر گروہ کو اسی قسم کے داخلی اور خارجی اعضاء دیئے گئے جس قسم کی ضرورتیں اس کو پیش آتی ہیں۔ عام حیوانات پر نظر ڈالو! اونٹ کی غذا جنگل کی خاردار گھاس ہے اس لیے اس کو ویسی ہی زبان اور اسی قسم کے دانت بخشے گئے جو ان تیز و سخت شاخوں کو آسانی سے چبا سکتے ہیں اور ان کی سختی کے متحمل ہونے کی طاقت رکھتے ہیں۔ شیر کی غذا دوسرے زندہ حیوان ہیں۔ اس لیے اس کے پنجے نہایت تیز اور سخت اور ایسے خاردار بنائے گئے جن کا ایک وار بھیڑ اور بکری کی ہلاکت کا باعث ہو سکتا ہے۔ انہی فرائض کی انجام دہی کا مجموعی نام تمدن یا نظام عالم ہے۔ جب کوئی گروہ اپنے طبعی فرائض کے ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے "نظام تمدن کی بنیادیں ہلنے لگتی ہیں" یہی وہ نکتہ ہے جس کی طرف کلامِ الٰہی نے اشارہ کیا ہے:۔

ربنا الذی اعطی کل شیءٍ خلقہ ثم ھدی ہمارا خدا وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کا مکمل وجود عطا فرمایا۔ پھر اسے اپنے فرائض بجا لانے کی ہدایت کی۔

انا کل شیءٍ خلقنٰہ بقدر ہم نے ہر چیز کو ایک اندازۂ خاص پر پیدا کیا ہے نیچرل فلاسفی کا یہ قول خلاق عالم کے انہی ارشادات کی تفسیر ہے کہ "طبیعت اپنی حد سے کبھی نہیں بڑھتی"۔

بے شک انسان فطرتاً آزاد ہے اور یہ آزادی اس کے ہر ارادی اور غیر ارادی فعل سے ظاہر ہوتی ہے۔

لیکن آزادی کو تسلیم کرتے ہوئے اس امر کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ انسان کا اپنے حقیقی فرائض کو ادا کرنا نظام تمدن کا اصلی عنصر ہے انسان ان مختلف قوتوں کے مجموعے کا نام ہے جن میں بعض قوتیں اگر صفاتِ حسنہ کی طرف آمادہ کرتی ہیں تو بعض قوتیں برائیوں کے لیے ترغیب دیتی ہیں۔ اس میں سینکڑوں خواہشیں اس قسم کی موجود ہیں جن کے اثرات میں محیط ہو کر وہ عقل و تمیز کو کھو بیٹھتا ہے تعلیم اور سوسائٹی کا خارجی اثر بسا اوقات ان طبعی قوتوں کے اثرات کو قوی اور تیز کر کے اس طرح پر اپنا تسلّط قائم کر لیتا ہے کہ جمادات و نباتات کی طرح مجبورِ محض ہو کر انہی کے اشاروں پر چلتا اور انہی کی تحریک پر ہر کام کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے ایسی حالت میں نہ اسے اپنے فرائض یاد رہتے ہیں نہ دوسرے کے فرائض کی کچھ پروا کرتا ہے ظاہر ہے کہ اس تسلّط سے نکلنے کے لیے نہ علم و فضل کام آسکتا ہے نہ فلسفہ و عقلیات کی تعلیم کچھ مدد کر سکتی ہے۔ اس لیے تمدن اور مذہب نے انسان کی فطری آزادی کو ایک خاص حد تک مقیّد کر دیا ہے۔ ہر گروہ کے طبعی فرائض تشخیص کیے ہیں اور انہی فرائض کے میدان میں اسے محدود کر دیا ہے۔ ان فرائض کے لحاظ سے جس حد تک آزادی حاصل کرنے کا وہ مستحق ہے اسے بخشی ہے۔ اور جو آزادی ان کے فرائض میں خلل انداز ہوتی ہے اسے قطعی مجرم قرار دیا ہے۔ اب اس اصول کو ذہن نشین کر کے عورتوں کی حالت پر نظر ڈالو اور دیکھو کہ ان کے طبعی فرائض کیا ہیں؟ ان فرائض کے لحاظ سے وہ کس آزادی کی مستحق ہیں اور کونسی آزادی ان کو فرائضِ منصبی سے باز رکھ سکتی ہے۔

عورت کو قدرت نے دنیا میں جس غرض سے مخلوق کیا ہے وہ غرض نوع انسان کی تکثیر اور اس کی حفاظت و تربیت ہے، پس اس حیثیت سے اس کا قدرتی فرض یہ ہے کہ اس اہم فرض کی انجام دہی کے لیے ہمیشہ کوشش کرتی رہے۔ اس فرض کی انجام دہی کے لیے جن اعصاب اور اعضا میں تناسب کی ضرورت تھی قدرت نے اسے عطا کیے ہیں جس طرح مردوں کی طاقت سے یہ امر بالکل باہر ہے کہ وہ عورت کے طبعی فرائض میں حصہ لیں۔ اسی طرح عورت کی طاقت سے بھی یہ امر باہر ہے کہ وہ مردوں کے علمی و تمدنی مشاغل میں شریک ہو۔

نوعِ انسانی کی تکثیر اور حفاظت کے لیے قدرت نے مسلسل چار دور قرار دیئے ہیں۔ حمل۔ وضع۔ رضاعت۔ تربیت۔ ان میں سے ہر ایک دور کا زمانہ عورت کی زندگی کا نہایت اہم اور دشوار زمانہ ہوتا ہے اس کی حفاظت اور صحت کے لیے خاص خاص احتیاطوں اور علاجوں کی ضرورت پڑتی ہے جن میں اگر کسی قسم کی کمی کی جائے تو سخت خطروں اور شدید بیماریوں میں مبتلا ہونے کا خوف ہوتا ہے۔ عالموں کی کچھ خصوصیت

نہیں جاہل شخص بھی اس امر کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ متاہل اور صاحب اولاد ہو کہ ان چار زمانوں اور بالخصوص ابتدائی تین زمانوں میں عورت کی زندگی کو کن کن خوفناک خطروں کا سامنا ہوتا ہے۔ کس طرح وہ بعض وقت اپنی زندگی سے مایوس ہو جاتی ہے اور کس طرح ان مصیبتوں سے سخت مشکلوں کے بعد نجات پاتی ہے علم طب کا بہت بڑا حصہ ان چار دوروں کے لوازم احتیاط اور قوانینِ صحت کے متعلق مختلف مباحث سے تعلق رکھتا ہے۔ قدیم و جدید زمانے کے سینکڑوں عالموں اور تجربہ کار ڈاکٹروں نے اپنی عمریں صرف کرکے اس مسئلہ کی مشکلات اور مصائب دور کرنے کے لیے کتابیں تصنیف کی ہیں جن کے مطالعہ سے ان چاروں دوروں کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے انسان کی جہالت کا اصلی مبدا انہی زمانوں کی بے احتیاطی ہے اور انسانی خوبیوں کا حقیقی سرچشمہ بھی ان ہی زمانوں کی حفاظت ہے۔

زمانۂ حمل جس کی مدت عام طور پر نو ماہ قرار دی گئی ہے عورت کیلیے ایک ایسا نازک زمانہ ہوتا ہے جس میں وہ گھر کے فرائض ادا کرنے کے قابل بھی نہیں ہوتی۔ اسکی ہر معمولی سے معمولی حرکت کا اثر نہ صرف اسکی ذات تک محدود رہتا ہے بلکہ اس میں وہ نازک و ضعیف وجود بھی شامل ہوتا ہے جس کی حفاظت اور تربیت قدرت نے اسکے سپرد کی ہے۔ اس نو مہینے کے زمانے میں جنین پر مختلف دور طاری ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک دور کے خاص آثار اور علامات ہیں۔ اور ہر علامت کے زمانہ میں خاص خاص احتیاطیں اور حفاظتیں ضروری ہیں۔

زمانۂ حمل میں ماں کی ہر حالت سے جنین اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ اس کے ضعف و قوت یا زندگی و موت کا دار و مدار محض ماں کی احتیاط اور حفاظت پر ہوتا ہے۔

اطبائے جدید و قدیم کا قول ہے کہ زمانۂ حمل میں عورت کو نہایت شدت کے ساتھ اپنے خیالات، مزاج اور افعال کی نگہداشت کرنی چاہیئے ورنہ جس قسم کے حالات اس کو پیش آئیں گے جنین کی جسمانی اور دماغی حالت بھی اسی قسم کی ہوگی۔

یورپ کے سینکڑوں تجربوں سے بھی اس قول کی تصدیق ہے۔ مختلف بچوں کے عادات و اطوار اور جسمانی قوت کے مبداء کا جب سراغ لگایا گیا تو زمانۂ حمل کے حالات ثابت ہوئے۔ فرانس میں خوبصورت والدین کا بچہ جب سیاہ رنگ و حبشیوں کی سی صورت پر پیدا ہوا تو ڈاکٹروں کو اس اختلاف پر سخت حیرت ہوئی۔ تحقیق سے ثابت ہوا کہ زمانۂ حمل میں ماں کی نشست کے سامنے میز پر ایک حبشی کا اسٹیچو رکھا رہتا تھا جس کی سیاہ ہیئت اور رنگ کا اثر نگاہوں کے ذریعہ دماغ میں پہنچا اور ذہن کو اس طرف غیر معمولی توجہ ہوگئی اسی کا نتیجہ ہے کہ بچے کو والدین کی صورت سے کوئی تعلق نہ رہا اور اس حبشی کی ڈیل ڈول پر پیدا ہوا۔

لے اصول تحفۃ فی اصول تشتیت مطبوعہ بیروت ۱۲

وضع حمل ۔ وضع حمل کا وقت زمانہ حمل سے زیادہ سخت دشوار ہوتا ہے جس میں عورت کی زندگی
موت سے نہایت قریب ہو جاتی ہے۔ وضع کے بعد عورت نہایت سخت بیماری اور حقیقی ضعف میں مبتلا ہو جاتی
ہے جس کا اثر مدت تک زائل نہیں ہوتا اور مدت کے بعد عورت کی زندگی از سر نو شروع ہوتی ہے اطبا نے نہایت
ضخیم ضخیم کتابیں اس وقت کے قواعد صحت اور قوانین احتیاط پر تصنیف کی ہیں اور وہ علاج بتائے ہیں جن سے ان
مختلف اقسام کے بخاروں سے حفاظت ہو سکتی ہے جو بسا اوقات عورت کے لیے باعثِ موت ہو جاتے ہیں
یہ وقت عورت کے لیے جس قدر نازک اور سخت ہے اس کا معمولی شخص اندازہ کر سکتا ہے۔ ہر سال دنیا
میں ہزاروں جانیں صرف اس لیے ضائع ہو جاتی ہیں کہ قوانین طبیہ کے مطابق وضع حمل کے موقع پر احتیاط اور حفاظت
نہیں کی جاتی۔

رضاعت ۔ تیسرا دور رضاعت کا زمانہ ہے یہ زمانہ اگرچہ ماں کے لیے اس درجہ سخت اور دشوار نہیں
جس قدر ابتدائی دور ہوتے ہیں لیکن بچہ کے لیے سب سے زیادہ خطرناک اور غیر معمولی توجہ محتاج ہوتا ہے۔ اس
زمانے کی حفاظت کے لیے خاص قواعد اور قوانین ہیں جن کی تعمیل میں اگر کسی قسم کی کوتاہی ہوتی ہے تو بچہ کی جان یا
خطرہ میں پڑ جاتی ہے یا ہمیشہ کے لیے کوئی جسمانی اور دماغی نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ ایامِ رضاعت میں ماں کی
احتیاط اور قواعد طبی پر عمل اس لیے ضروری ہے کہ جس قسم کی غذا اس کے استعمال میں آتی ہے اسی قسم کا اثر بچہ
پر مترتب ہوتا ہے۔ اگر ماں گرم غذا کا (اعتدال اور قاعدے سے) زیادہ استعمال کرتی ہے تو اس کا مضر اثر جس
طرح خود ماں پر پڑتا ہے۔ اسی طرح بچہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض بچے نہایت سخت بیماریوں
میں اس لیے مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ایامِ رضاعت میں ماں بے احتیاطی سے بعض مولدِ امراض چیزوں کو استعمال
کر لیتی ہے۔ ان کا مضر اثر دودھ کے ذریعے سے بچے تک پہنچتا ہے اور مختلف امراض کا باعث ہوتا ہے
علاوہ اس کے بچے کی جسمانی شگفتگی اور دماغی صحت اس پر موقوف ہے کہ یومِ ولادت سے آخر ایامِ
رضاعت تک غذا میں، لباس میں، اور صفائی میں کسی قسم کی بے احتیاطی نہ کی جائے۔ اور ایک لحظہ بھی بچہ پر
ایسا نہ گزرے کہ ماں کی اس حالت سے غافل ہو۔ ہمارے ملکوں میں ہزاروں بچے نشو و نما پانے سے پہلے
اس دنیا سے منہ موڑ لیتے ہیں کہ ان کی مائیں ان ضروری قواعد سے ناواقف اور بے خبر ہوتی ہیں۔

تربیت ۔ چوتھا دور زمانہ تربیت ہے اور درحقیقت بلحاظ اہمیت کے اور بلحاظ ان اثرات کے
جن پر انسانی زندگی کی تمام آئندہ خوبیاں منحصر ہیں، پہلے تینوں دوروں سے زیادہ خطرناک اور بہت زیادہ

قابلِ توجہ ہے۔

بچہ جب عالمِ غیب سے یکایک دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اس کا دماغ آئینے کی طرح ہوتا ہے جس کی سطح
بالکل صاف اور ہر قسم کے اثرات قبول کرنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ نہ کسی کا عکس اس میں نظر آتا ہے اور نہ کسی کی تصویر
اس پر منقش ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں جس قسم کا عکس اس پر ڈالا جاتا ہے ہمیشہ کے لیے قائم ہو جاتا ہے۔ اگر خوشنما
نقش و نگار سے اس کی سطح مزین کی گئی تو ہمیشہ کے لیے وہ آئینہ خوبصورت ہو گیا۔ اگر بدقسمتی سے کسی نادان
اور جاہل نے ٹیڑھی سیدھی لکیریں کھینچ دیں تو ہمیشہ کے لیے بدنما ہو گیا۔ اس کی صاف و شفاف سطح سیاہ و سفید
سے محض بے خبر ہوتی ہے۔ اس لیے اس کو کسی رنگ کے قبول کرنے میں انکار نہیں ہوتا اور جس مصور کے
ہاتھ قدرت نے اسے سپرد کر دیا ہے اس کی ہر بات کے آگے سرِ تسلیم جھکا دیتی ہے۔

یہی حال اس تازہ وارد مسافر کا ہوتا ہے جس کے لیے دنیا اور دنیا کی ہر بات بالکل نئی ہوتی ہے۔ اس
کے کان جس طرح فضائلِ انسانی سے ناآشنا ہوتے ہیں اسی طرح رذائلِ انسانی سے بے خبر ہوتے ہیں وہ نہیں
جانتا کہ رحم کیا چیز ہے اور ظلم کس کو کہتے ہیں۔ نہ اس کو اس کی خبر ہوتی ہے کہ علم انسانی خوبیوں کا سرچشمہ ہے اور
جہل تمام برائیوں کا مخزن ہے۔ اس کا سادہ ذہن آئینہ کی طرح ہر قسم کے نقش و نگار سے خالی ہوتا ہے۔ مگر ہر نقش
کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کی شفیق ماں اس کی فطرتی معلم ہوتی ہے جس کی
توجہ اور تربیت یا تو اخلاقِ محاسن کا نقش اس کے دماغ پر نقش کالحجر کر دیتی ہے یا تمام رذائلِ انسانی کا عادی بنا کر
نہ صرف اس کی بلکہ سوسائٹی کے ہر فرد کی زندگی ہمیشہ کے لیے تلخ کر دیتی ہے۔ اسی زمانہ میں وہ عادات انسان کی
طبیعتِ ثانیہ ہو جاتے ہیں جن کو نہ اعلیٰ تعلیم کا اثر زائل کر سکتا ہے نہ ساری عمر کی جد و جہد و کوشش کھو سکتی
ہے۔ قوموں کی ترقی کا بڑا راز تاریخ بتلاتی ہے کہ قومی افراد کی ہی ابتدائی تربیت ہے جو انسان اپنی زندگی کے
ابتدائی حصہ میں صرف ماں کی کوشش اور توجہ سے حاصل کر سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جس گروہ کا قدرتی فرض ایسے اہم اور ضروری معاملہ کا فیصلہ کرنا ہے کیا وہ دنیاوی مادی
کشمکش میں شریک ہو سکتا ہے؟ اور کیا اس قسم کی شرکت اس کے قدرتی فرض میں حارج نہ ہوگی؟ [illegible]
عورت علم و تدبر کے اعلیٰ درجہ تک ترقی کر سکتی ہے [illegible]
لیکن ساتھ ہی تاہل اور معاشرت کے طبعی نتائج نے اس کو زمانۂ حمل و رضاعت میں بھی مقید کر دیا ہے۔ تو ایسی
حالت میں وہ اپنی پارٹی کی حمایت اور سیاسی مناقشات کے فیصلہ کی طرف [illegible] غور کر سکے گی اور [illegible] ذرا سی فکر

میں سرگرم رہے گی یا ان تدابیرِ صحت اور قوانینِ احتیاط پر عمل کرے گی جن کی تعمیل میں ذرا سی کمی اس کی اور جنین کی ہلاکت
کا باعث ہو جاتی ہے اس کا قدرتی فرض تو یہ ہے کہ اس دور کا تمام زمانہ ان افکار اور اعمال میں گزر دے جن کا
اثر جنین کی جسمانی و دماغی ساخت کے لیے مفید ہو۔ لیکن سیاسی ضرورتیں اس کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ پریشانیٔ
دماغ اور نہایت تلخ و ناگوار افکار میں مبتلا ہو کر سخت بے چینی اور بے اطمینانی میں یہ زمانہ صرف کر دے تو کیا
ایسی حالت میں یہ شرکت اس کے قدرتی فرض میں خلل انداز نہ ہوگی؟ اور کیا اس کی صحت کے لیے مضر نہ ہوگی؟
اس مثال پر موقوف نہیں۔ فرض کرو کہ ایک عورت نے "قانونی تعلیم" کو بدرجۂ کمال حاصل کر کے ایک کامیاب
بیرسٹر کی صورت میں آپ کو پبلک پر ظاہر کیا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی گود میں ایک ننھا سا وجود بھی اس کی توجہ
اور محبت کے انتظار میں اس کی صورت کو تک رہا ہے۔ ایسی حالت میں اس کا دن بھر کسی مجرم کی مدافعت میں وہ
ان قانونی پہلوؤں کی تلاش میں جو اس کے موکل کے لیے مفید ہوں مصروف رہنا اور شب بھر سندوں اور نظیروں
کی جستجو میں قانون کی ضخیم ضخیم کتابوں کی ورق گردانی میں منہمک رہنا کہ صبح کو مقدمہ کی پیشی ہونے والی ہے کیا اس کو ایامِ
رضاعت کے نازک فرائض سے باز نہ رکھے گا؟ اور کیا اپنی پوری توجہ اور قوت کو مجرم کی مدافعت کی کامیابی
کے لیے صرف کر دینا اور اسی فکر و کوشش میں رہنا اس کو بچہ کی نگہداشت اور تربیت سے غافل رہنے پر مجبور
نہیں کرے گا؟ عورت کے طبعی فرائض کی ہدایت تو یہ ہے کہ یومِ ولادت سے لے کر آخر ایامِ طفولیت تک
بچے کی ہر حرکت اور ہر فعل کی نگہداشت کرے۔ عمدہ خصائل کا اسے عادی بنائے۔ بری عادتوں سے محفوظ
رکھے لیکن اس بدقسمت بچہ کا کیا حال ہوگا۔ جب اس کی بیرسٹر ماں عدالت میں فریقِ مخالف پر جرح کر رہی ہو
گی اور اس کا شیر خوار بچہ اس کی توجہ اور تربیت کا منتظر جھولے میں پڑا ہوگا؛ یا اس بدنصیب بچہ کی صحت
اور زندگی کس حالت میں ہوگی جب وہ صالح اور مفید دودھ کا محتاج ہوگا اور اس کی مدبرہ اور پارلیمنٹ کی
ممبر ماں لبرل پارٹی کی حمایت کے خیال میں رات دن مستغرق اور مختلف جد و جہد میں منہمک ہوگی؟ اور ناکامی
کے انفعال و افسوس نے دودھ میں فساد پیدا کر کے بچے کی طبعی غذا کو اس کے لیے مضر اور خطرناک بنا دیا ہوگا؟
کیا یہ اور اس قسم کی ظاہر مثالیں اس امر کے سمجھنے کے لیے کافی نہیں کہ قدرت نے عورت کو مردوں کے
مشاغل سے الگ رکھا ہے اور اس کے طبعی فرائض اس قدر مصروفیت طلب اور محتاجِ توجہ ہیں کہ عورت
کا مردوں کے ساتھ شریک ہونا بغیر اس کے محال ہے کہ وہ طبعی فرائض کی ادائیگی سے بے خبر یا دست بردار
ہو جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے دنیا کے کاموں کے خود ہی دو حصے کر دیے ہیں۔ نوعِ انسانی کی حفاظت اور تکثیر اور انسانی ضروریات کا انتظام پہلا کام عورت کے ذمے قرار دیا گیا۔ اس لیے اس کو اسی قسم کے اعضا اور اسی قسم کی جسمانی قوت دی گئی جو اس فرض کی انجام دہی کے لیے ضروری ہیں۔ دوسرا کام مرد کے متعلق کیا گیا۔ اس لیے اس کے مطابق جسمی اور دماغی طاقت عطا کی گئی۔ ان دونوں گروہوں کا الگ الگ کام دنیا کا مجموعی تمدن قائم رکھتا ہے اور جب اختلاف کے مٹانے کی کوشش ہوتی ہے یا کوئی گروہ اپنے فرائض سے باہر قدم نکالتا ہے تو تمدن اور معاشرت کے انتظام میں خلل پڑ کر سینکڑوں دقتیں اور مشکلیں پیدا ہو جاتی ہیں اس لیے عورت کے طبعی فرائض کا تقاضا اس خیال کا بالکل مخالف ہے کہ اس کو مردوں کے فرائض میں شریک کیا جائے اسی کا نتیجہ ہے کہ جہاں جہاں اس خیال کی تائید کی گئی اور عورتوں کو مردوں کے میدان میں قدم رکھنے کی اجازت دی گئی وہاں بالکل کامیابی نہیں ہوئی اور معاشرت میں ہزاروں خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ کیونکہ یہ قدرت کا قانون ہے اور کوئی انسانی کوشش اس کے خلاف کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتی

بس ہمارا فرض یہ ہونا چاہیئے کہ ہم ہمیشہ کوشش کرتے رہیں کہ عورت اپنے طبعی فرائض کے میدان میں محدود رہے اور ان فرائض کو قدرت کی ہدایت کے مطابق انجام دے۔ اور اگر ہم دیکھیں کہ عورت اپنے طبعی فرائض سے دور رہی ہے تو اس کو ایک تمدنی مرض سمجھیں اور اس کے علاج کے لیے جدوجہد کریں۔ کیوں کہ عورت فلسفہ و علوم کے ہزار مرحلے طے کر لے مگر اپنے طبعی وظیفہ سے غافل رہے تو غیر ممکن ہے کہ وہ علم و فضل اس کے لیے یا سوسائٹی کے لیے مفید ہو سکے۔

عورتوں کی آزادی کے متعلق پہلا اعتراض یہ کیا جاتا ہے:-

"انسان فطرتاً آزاد ہے۔ پھر وہ کونسا معیار ہے جس کی بنا پر عورتیں اس آزادی سے محروم رکھی جاتی ہیں؟"
اس اعتراض میں یہ امر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ عورتیں آزادی سے محروم ہیں لیکن جب سوال کیا جاتا ہے کہ کیونکر؟ تو جواب میں دو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ عورتوں کو تعلیم نہیں دی جاتی۔ دنیا کے عام تمدنی اور سیاسی مشاغل میں شریک نہیں کیا جاتا۔
۲۔ ان کو پردہ میں قید کے ساتھ رکھا جاتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مردوں کی طرح آزاد نہیں ہیں۔

قاسم امین بک نے بھی ان ہی دو دلیلوں پر زور دیا ہے اور مختلف واقعات پیش کر کے ثابت کر

دیا ہے کہ پردہ میں عورتوں کو مقید رکھنا اور مردوں کی طرح عام تمدنی مشاغل میں شریک نہ ہونا عورتوں کی غلامی اور فطری آزادی سے محرومی کا بین ثبوت ہے۔[1]

ہم اس کے جواب میں دوراز کار بحثوں سے چشم پوشی کر کے صرف عورتوں کے طبعی فرائض پیش کر دیتے ہیں جن کو تم پہلی فصل میں پڑھ آئے ہو۔ اس پر ایک نظر ڈالو اور غور کرو کہ قاسم امین بک کا خیال کہاں تک صحیح ہے؛ پہلی دلیل کا جواب ظاہر ہے کہ جس گروہ کے طبعی فرائض ایسے اہم اور دشوار ہوں کیا وہ مردوں کی طرح عام تعلیم حاصل کر کے دنیا کی تمدنی اور سیاسی کش مکش میں شریک ہو سکتا ہے؛ عورتوں کو مردوں کے جبر نے ان مشاغل سے دور نہیں رکھا۔ بلکہ خود فطرت نے مردوں کی دنیا سے عورتوں کو الگ کر دیا ہے اس لیے الزام قدرت پر ہونا چاہیئے نہ کہ مردوں پر۔

پردہ کی بحث مستقل عنوان سے آگے آئے گی۔ لیکن عورتوں کے طبعی فرائض پر نظر کرتے ہوئے کیا اس امر کے تسلیم کرنے میں کسی کو عذر ہو سکتا ہے کہ مردوں کی نسبت عورتوں کو ایک خاص حد تک تقیّد میں رہنا چاہیئے۔ قدرت نے ہر گروہ کے فرائض مقرر کر دیئے ہیں اور اقتضائے فرائض کے لحاظ سے ایک خاص حد تک مقید بھی کر دیا ہے۔ مذہب اور تمدن کا دنیا میں یہی کام ہے۔ اس بنا پر اگر عورتوں کی آزادی کو کسی مناسب حد تک مقید نہ کیا جائے تو طبعی فرائض کی انجام دہی میں سخت خرابیاں پیدا ہو جائیں۔

عورتیں اور مرد دو مختلف گروہ ہیں۔ اس لیے ان دونوں کے میدانِ عمل کو الگ الگ کر کے پردہ کو بیچ میں حدِ فاصل قرار دیا گیا تاکہ ہر گروہ اپنے میدانِ عمل میں محدود رہے۔ اس حدِ فاصل کے اٹھانے کی جب کوشش کی جاتی ہے تو تمدن و معاشرت کی بنیادوں میں حرکت پیدا ہو کر دنیا کو خبردار کر دیتی ہے کہ عنقریب عمارت گرنے والی ہے۔ اس امر کے ثبوت کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ یورپ کی موجودہ حالت کافی ہے۔

قاسم امین بک نے آزادی کی تعریف ان جملوں میں کی ہے۔

"آزادی سے ہماری غرض یہ ہے کہ مذہب اور تمدن نے جو حدود قائم کر دیئے ہیں ان سے واقف ہونے کے بعد انسان اپنے خیالات، اعمال اور ارادے میں مستقل بالذات ہو۔"

جب مذہب اور تمدن کی قید ضروری اور مسلم ہے تو ناظرین اس امر کا فیصلہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔

---

[1] المراۃ الجدیدہ ۱۲

کہ کیا عورتوں کا طبعی وظیفہ اس امر کا مقتضی ہے کہ ان کو مردوں کے تمدنی اور سیاسی مشاغل میں شریک کیا جائے اور کیا مذہب اور تمدن کے مصالح اقتضائے فرائض کے لحاظ سے عورتوں کو ایک خاص حد تک مقید رکھنا ضروری نہیں قرار دیتے ؟ یورپ کے مشہور مصنفوں کے جو اقوال تیسری فصل میں درج کیے جائیں گے ان کے دیکھنے کے بعد تم خود اندازہ کر لوگے کہ یہ صرف ہماری ہی تنہا رائے نہیں ہے بلکہ یورپ کے تمام جیدہ مصنفین اس مسئلہ میں ہمارے ہم زبان ہیں۔ ان کی متفقہ آواز پکار پکار کہہ رہی ہے کہ :۔

"عورتوں کا طبعی فرض نوعِ انسان کی حفاظت اور تربیت ہے اس دائرے سے عورت جب قدم باہر نکالتی ہے تو عورت نہیں رہتی۔ بلکہ عورت اور مرد کے علاوہ ایک تیسری جنس کا نمونہ بن جاتی ہے"

وہ یورپ کی عورتوں کو عورت تسلیم کرنے میں تامل ظاہر کرتے ہیں اور آزادی کی خواہش کو ایک خالص خبط اور نری وحشت قرار دیتے ہیں۔
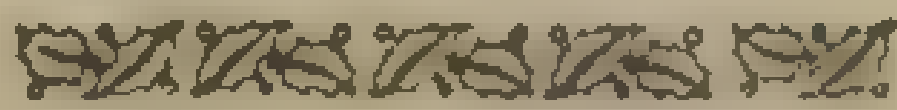
مرد اور عورت جسمانی اور دماغی قویٰ میں برابر ہیں؟

سر قضا کہ در تحقیق غیب منزلیست
مستانہ آتش نقاب ز رخسارہ برکشیم

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یورپ میں عورتیں اس کوشش میں مصروف ہیں۔ کہ مردوں کے تسلط سے قطعاً بالکل آزاد ہو جائیں اور اپنے آپ کو جسماً اور عقلاً ان کے برابر ثابت کردیں تو ہم کو سخت افسوس ہوتا ہے۔ اور یہ افسوس اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ خیال مضر اور ناقص تعلیم کے ذریعہ مغرب سے مشرق کی طرف قدم بڑھا رہا ہے اور بعض نادان اور سادہ لوح اس کی ظاہری صورت کی مصنوعی دلفریبی پر شیفتہ و فریفتہ ہو کر اس کے خیر مقدم کا سامان کر رہے ہیں۔ اس لیے ہم اس فصل میں علمی دلائل پیش کر کے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ عورتوں کی مفروضہ آزادی کا خیال اور مساوات کا خبط محالات کے اقسام میں سے ایک ایسی قسم ہے جس کی طرف اس شخص کا ذہن منتقل ہو سکتا ہے جو حواس کی بدولت برباد کر چکا ہو اور دیوانگی اور جنون کے دیو کا رعب اس کے دماغ کو معطل کر چکا ہو۔ ہم یورپ کے مشاہیر عقلاء اور سربرآوردہ علماء کی سائنٹیفک رائیں نقل کر کے بتلانا چاہتے ہیں کہ جو شخص اس خیال کی کامیابی کے لیے کوشش کرتا ہے اس کی مثال بعینہٖ اس مجنوں کی سی ہے جس کے سر میں قوانینِ قدرت کے تغیر و تبدل کا سودا سما جائے اور وہ اپنی قیمتی جہد و کوشش اس انہونی اور عبث بات کے لیے صرف کر دے۔

قاسم امین بک نے المرأۃ الجدیدہ میں جابجا اس امر پر زور دیا ہے کہ یورپ نے غفلت کے اس قدیم پردے کو اپنی علمی تحقیقات سے چاک کر دیا ہے جس نے اس وقت تک عورتوں کی اصلی حالت کو پوشیدہ رکھا تھا۔ علمِ تشریح۔ فزیالوجی کی تحقیقات اور تجارت نے ثابت کر دیا کہ مردوں اور عورتوں میں کسی

قسم کا جسمانی یا دماغی فرق نہیں ہے اور جو کام ایک مرد اپنی قوت دماغی سے انجام دے سکتا ہے بعینہ اسی طرح ایک عورت بھی انجام دے سکتی ہے۔

حضرت قاسم امین بک ہی کا یہ دعویٰ نہیں ہے بلکہ جب کبھی عورتوں کی آزادی کا مسئلہ چھیڑا جاتا ہے تو فریق مخالف کی طرف سے عموماً یہی دعوے پرزور الفاظ میں پیش ہوتا ہے۔ اس لئے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے ہمارا ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ اس دعوے کی قطعی صداقت کا فیصلہ کر دیں۔

قاسم امین بک نے اس دعوے کے ثبوت میں صرف دو قول پیش کیے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:-

ہمارے اس دعوے کی تصدیق پروفیسر فرش لو اور مسٹر جان جارڈ جیسے علماء کے اقوال سے ہو سکتی ہے۔ آخرالذکر محقق فزیالوجی کا پروفیسر اور اول الذکر دماغی ماہر ہے۔ فرش لو لکھتا ہے کہ:-

میں نے ایک عرصہ تک علم ریاضی، اخلاق اور فلسفہ کی تعلیم دی ہے میرے شاگردوں میں ایک بڑی تعداد عورتوں کی بھی تھی۔ مگر میں نے تعلیمی ترقی کے لحاظ سے عورتوں میں کسی قسم کا دماغی ضعف نہیں پایا۔ اور مجھ پر ہمیشہ یہی ثابت ہوا کہ مرد اور عورت کے دماغی قویٰ میں ذرہ بھر فرق نہیں ہے۔

مسٹر جان جارڈ اپنی کتاب "عورت اور فزیالوجی" میں لکھتا ہے کہ:-

تشریحی تحقیقات کی رو سے عورت اور مرد میں کسی قسم کا فرق ثابت نہیں ہوتا۔

پھر ان دو راؤں کی بنا پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ:-

علم فزیالوجی کے وہ مشہور اور باعظمت علماء جو نہایت باریک نگاہ عورتوں کی جسمانی اور دماغی حالت پر رکھتے ہیں۔ اس امر پر متفق ہیں کہ عورت تمام قوائے عقلیہ میں مرد کے برابر درجہ رکھتی ہے۔

ان اقوال اور دعاوی کو دیکھ کر ہر شخص یہی رائے قائم کرے گا کہ یورپ کے منتہی علماء عورت کو مرد سے کسی بات میں کم نہیں سمجھتے اور قوائے عقلیہ کے لحاظ سے دونوں کو ایک درجے میں رکھتے ہیں۔ مگر درحقیقت یہی وہ دھوکا ہے جس میں ہندوستان کی سرزمین کی ایک جماعت مبتلا ہے۔ اور جس کی وجہ محض کوتاہ نظری اور معلومات کی کمی ہے۔ اگر دو راؤں کے مقابلہ میں یورپ کے محقق علماء کی رائیں دیکھی جائیں تو معلوم ہو جائے کہ یورپ کا فاضل ترین حصہ ہرگز اس خیال کو تسلیم نہیں کرتا۔ ہم ان دو قولوں کے مقابلہ میں بیسیوں اقوال پیش کریں گے اور ان لوگوں کے جو آج یورپ میں موجودہ مدنیت کے مجدد ــــــ بہترین مصنف اور فلسفۂ حق کے جلیل القدر عالم تسلیم کیے جاتے

ہیں۔ سب سے پہلے عورت کے جسمانی ضعف پر نظر ڈالو اور غور سے دیکھو کہ قاسم امین بک اور اس کے ہم خیال لوگوں کا دعوائے مساوات کہاں تک صحیح ہے؟

(۱) علم تشریح کی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ مرد کی جسمانی حالت عورت کی نسبت بہت زیادہ قوی ہے یہ جسمانی اختلاف محض قیاس اور ظن پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس یقینی درجہ تک پہنچ چکا ہے جس کو تسلیم نہ کرنا مشاہدات اور محسوسات کا انکار کرنا ہے اس جسمانی اختلاف کی بنا پر یورپ میں بعض علمائے تشریح عورت کو موجودہ زمانے کے ترقی یافتہ مرد کا حقیقی مقابل تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ عورت اس قدیم مخلوق کی یادگار ہے جو ترکیب جسمانی اور خلقی کمزوری میں اس کے مشابہ تھا اور اس کے قوائے جسمانی و عقلی اپنے اصلی درجے تک نہیں پہنچے تھے انسان کی مزاحمت نے اس مخلوق کو فنا کر دیا اور اس کی عورتوں پر غلبہ حاصل کر لیا۔ اس کی نسل سے موجودہ دور کی عورتیں پیدا ہوئیں ——— (انسائیکلوپیڈیا لفظ عورت) (۲)

(۲) انیسویں صدی کی انسائیکلوپیڈیا کا مصنف لفظ عورت پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

مرد و عورت میں اعضائے تناسل کی ترکیب و صورت کا اختلاف اگرچہ ایک بڑا اختلاف نظر آتا ہے۔ لیکن صرف یہی ایک اختلاف نہیں ہے۔ عورت کے اور تمام اعضاء سر سے پیر تک مرد کے اعضاء سے مختلف ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اعضاء بھی جو بنظر آخر الذکر سے بے حد مشابہ نظر آتے ہیں۔

پھر علم تشریح کی تحقیقات کے موافق عورتوں کے اعضاء پر نہایت دقیق بحث کی ہے اور تمام بحث کا آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے:۔

درحقیقت عورت کی جسمانی ترکیب قریب قریب بچے کی جسمانی ترکیب کے واقع ہوئی ہے اسی لیے تم دیکھتے ہو کہ بچے کی طرح عورت کا بھی حاسہ ہر قسم کے اثر سے بہت جلد اور بہت زیادہ متاثر ہو جاتا ہے۔ بچے کا قاعدہ ہے کہ اگر کوئی رنج اور افسوس کا واقعہ پیش آئے تو فوراً رونے لگتا ہے اور اگر کوئی خوشی کی بات ہو تو بے اختیار ہو کر اچھلنے کودنے لگتا ہے قریب قریب یہی حال عورت کا ہے کہ بہ نسبت مرد کے بہت زیادہ اس قسم کے جذبات سے متاثر ہوتی ہے کیونکہ یہ مؤثرات اسکے تصور پر اس طرح اثر ڈالتے ہیں کہ عقل کو ان سے لگاؤ نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ ان میں استقلال نہیں ہوتا اور اسی لیے سخت خوفناک

موقعوں پر عورت ثابت قدم نہیں رہ سکتی۔

(۳) علمی تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے قد کا اوسط طول مرد کے قد کی اوسط درازی سے بارہ سنٹی میٹر کم ہے۔ یہ فرق کسی خاص ملک یا قوم سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ جس طرح وحشی اقوام میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح متمدن ممالک میں بھی پایا جاتا ہے۔ اور جوانوں کی طرح بچے بھی اس اختلاف کی شہادت دیتے ہیں۔

(۴) جس طرح قد کے اوسط میں فرق پایا جاتا ہے اسی طرح جسم کے وزن اور ثقل میں بھی اختلاف ہے۔ مرد کے جسم کا متوسط ثقل پینتالیس کیلو ہے۔ مگر عورت کے جسم کا متوسط ثقل بیالیس کیلو اور نصف سے کسی حالت میں زیادہ نہیں ہوتا۔ یعنی عورت کے جسم کا ثقل مرد کے ثقل سے پانچ کیلو کم ہوتا ہے۔

(۵) عضلات کے حجم وقوت کے لحاظ سے بھی عورت مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ڈاکٹر [illegible] اپنی [illegible] میں لکھتا ہے کہ:-

مجموعی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو عورت کے جسم کے عضلات مرد کے عضلات سے کئی درجہ ضعیف ہیں اور حجم و قوت کے لحاظ سے اول الذکر کے عضلات اس قدر ضعیف ہیں کہ اگر ان کی طاقت کے تین حصے کیے جائیں تو دو حصے قوت مرد کے حصے میں آئے گی اور صرف ایک حصہ قوت عورت میں ثابت ہوگی۔ عضلات کی حرکت کی سرعت اور ضبط کا بھی یہی حال ہے۔ مرد کے عضلات جسم عورت کی نسبت حرکت میں زیادہ تیز اور اپنے فعل میں زیادہ قوی ہیں۔

(۶) قلب۔ جو انسانی زندگی کا اصلی مرکز ہے اس طرح اس میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے علمی تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ عورت کا قلب مرد کے قلب سے ساٹھ گرام چھوٹا اور ہلکا ہوتا ہے۔

(۷) سرعت تنفس کے لحاظ سے بھی عورت اور مرد میں عظیم الشان اختلاف ہے [illegible] ہے کہ سانس کے ذریعہ سے کاربونک ایسڈ کے جو ذرات باہر نکلتے ہیں [illegible] سے بخارات بن کر سانس میں مل کر نکلتے ہیں۔ اس تجربہ کی بنا پر تحقیق کیا گیا ہے کہ مرد [illegible] گھنٹہ میں تقریباً گیارہ ڈرام کاربن کی مقدار جلا دیتا ہے۔ مگر عورت چھ ڈرام سے کچھ زائد جلاتی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کی حرارت غریزی بھی مرد کے مقابلہ میں بہت کم یا نصف سے کچھ ہی زائد ہے۔ عورت کا دماغی ضعف۔ یہ تمام تحقیقات اور انکشافات [illegible] قطعی دلیلوں سے ثابت کرتے ہیں [illegible] دعوے مساوات [illegible]

اس کا فیصلہ ناظرین کی طبع سلیم پر چھوڑ کر اب ہم اس مسئلہ کے دوسرے پہلو پر متوجہ ہوتے ہیں اور عورت اور مرد کا معنوی اختلاف اور الذکر کا دماغی ضعف و ضاعت کے ساتھ دکھلاتے ہیں۔

(۸) مشہور مسٹ فلاسفر علامہ پرو ڈن اپنی کتاب آبکاران مر میں لکھتا ہے کہ:۔

عورت کا وجدان بمقابلہ مرد کے وجدان کے اسی قدر ضعیف ہے جس قدر اس کی عقلی قوت کے مقابلہ میں ضعیف نظر آتی ہے اس کی اخلاقی قوت بھی مرد کے اخلاق سے بالکل مختلف ہے اور دوسری قسم کی طبیعت رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ جس چیز کے حسن و قبح کے متعلق وہ رائے قائم کرتی ہے وہ مردوں کی رائے سے مطابق نہیں ہوتی پس عورت اور مرد میں عدم مساوات کوئی عارضی امر نہیں ہے بلکہ عورت کی طبعی خاصیت پر مبنی ہے۔

حواسِ خمسہ جس پر انسان کی عقلی اور دماغی نشو ونما کا مدار ہے۔ اس میں بھی سخت اختلاف پایا جاتا ہے علامہ نیکولس اور علامہ بلی نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے حواسِ خمسہ مرد کے حواس سے ضعیف تر ہیں۔

(۱) عورت کی قوت شامہ کی طاقت سے یہ امر باہر ہے کہ وہ ایک خاص فاصلہ سے عطر لیموں کی خوشبو محسوس کر سکے برخلاف مرد کے کہ اس کی قوتِ شامہ اس قدر قوی ہے کہ وہ اس درجہ کی خوشبو کو آسانی سے محسوس کر لیتا ہے جس سے دو چند مقدار کی خوشبو سے عورت کو احساس ہو سکتا ہے۔

(ب) اسی طرح تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ عورت ملکے براسک ایسڈ کی بو ۱/۱۰۰ کی نسبت سے اور مرد ۱/۲۰۰۰۰ سے محسوس کر سکتا ہے یہ ضعف کی بیّن دلیل ہے۔

(ج) ذوق اور سمع کا حاسہ بھی عورت سے مرد کا بہت زیادہ قوی ہے اس کے لیے کسی تشریحی دلیل کی ضرورت نہیں۔ انسائیکلو پیڈیا نے تصریح کر دی ہے کہ

اسی ضعف کا نتیجہ ہے کہ طعام کی عمدگی اور بدمزگی پہچاننے والے ... کے پرکھنے والے اور پیانو کی راگوں کے نقاد کُل کے کُل مرد ہیں۔ ایک عورت نے بھی خود کو ان باتوں میں باکمال ثابت نہیں کیا۔

(د) قوت لامسہ کے متعلق علامہ لومبروزو اور سرجی وغیرہ استادوں کی متفقہ تحقیق ہے کہ عورت میں یہ قوت مرد کی نسبت بہت ضعیف پائی جاتی ہے ان کی متفقانہ دلیل یہ ہے کہ جن آلام اور تکالیف کی متحمل عورت ہوتی ہے۔ مرد اس قدر نہیں ہو سکتا۔ یہ ظاہر فرق بتلا رہا ہے کہ مرد کی نسبت عورت کی قوتِ احساس

ضعیف بلکہ ضعیف تر ہے۔ علامہ لومبروز کے اصلی الفاظ یہ ہیں۔

حمل اور وضع کی شدید تکلیف پر نظر ڈالو اور دیکھو کہ عورت دنیا میں کیسے کیسے آلام اور مصائب کی متحمل ہو سکتی ہے۔ اگر مرد کی طرح اس کا احساس قوی ہوتا تو ان تمام سختیوں کی کیونکر متحمل ہو سکتی؟ درحقیقت نوع انسان کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ قدرت نے اس کو قوی احساس سے محروم رکھا ہے ورنہ بقائے نوع انسان کے نازک اور تکلیف دہ فرائض کی انجام دہی ایک غیر ممکن بات ہو جاتی۔

(۳) قوتِ ادراک کا اصلی مرکز انسان میں "بھیجا" ہے۔ اسی کی کمی اور زیادتی اور ضعف و قوت پر ادراک کی تیزی اور سستی کا دار و مدار ہے۔ لیکن جب علم سائی کو وجیا[1] کے تجارب کو پیش نظر رکھ کر ہم غور کرتے ہیں تو اس میں بھی عورت ضعیف تر ثابت ہوتی ہے۔ علم مذکور نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے بھیجے اور مرد کے بھیجے میں مادۃً اور شکلاً سخت اختلاف ہے۔ مرد کے بھیجے کا وزن اوسط عورت کے بھیجے سے سو ڈام زیادہ ہے[2]۔ اگر کوئی اس کے جواب میں کہے کہ یہ زیادتی عورت اور مرد کے جسمانی اختلاف پر مبنی ہے تو یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ یہ تحقیق ہو چکا ہے کہ مرد کے بھیجے کی مقدار اس کی جسمی حالت سے وہ نسبت رکھتی ہے جو چالیس کے عدد کو ایک سے ہوتی ہے۔ مگر عورت کا بھیجا اس کی جسمانی قوت سے چالیس اور ایک کی نسبت رکھتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر عورت کے بھیجے کی کمی جسمانی ضعف پر مبنی ہے تو مقابلۃً یہ اختلاف کیوں پایا جاتا ہے؟

(۴) علاوہ اس کے عورت کے سر کے بھیجے میں خم و پیچ نہایت کم ہیں اور اس کے پردوں کا نظام بھی

---

[1] سائی کو وجیا کا عربی ترجمہ مصنف نے "علم النفس بالتجارب" کیا ہے۔ یہ وہ علم ہے جس سے انسان کے نفس اور دماغ کی اصلی ہیئت معلوم ہوتی ہے (دیکھو چیمبرز ڈکشنری صفحہ ۷۰۵)

[2] مصنف نے دماغی قویٰ پر بحث کرتے ہوئے دماغ کے وزن اور مخ کے اختلاف پر قصداً یا سہواً توجہ نہیں کی۔ حالانکہ عورتوں کے اصلی ضعف کی بنا اسی اختلاف پر ہے۔ دماغ کے وزن کا اختلاف ہم آگے چل کر دکھلائیں گے۔ لیکن بھیجے کی بحث میں مخ کے اختلاف کو جگہ دینی ضروری ہے۔ اصطلاح تشریح میں آخری حصے کو مخ کہتے ہیں۔ مرد کے دماغ میں بھیجے کے ساتھ مخ کی نسبت (۱) و (۸ ۱/۲) کی ثابت ہوئی ہے۔ مگر عورتوں کے دماغ میں زیادہ سے زیادہ (۱) اور (۸ ۱/۴) کی نسبت ہوتی ہے یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ مخ دماغ کے ان اجزاء میں سے ہے جن کی مقدار کی زیادتی پر عقل اور فکر کی تیزی اور بلندگی کا دار و مدار ہے۔ (دیکھو التوضیح فی اصول التشریح صفحہ ۲۲۴)

نامکمل ہے۔ علمائے سائیکولوجی نے اس اختلاف کو ان دونوں جنسوں کے ممیزات میں ایک اہم امر قرار دیا ہے۔

۵۔ اسی طرح مرد اور عورت کے بھیجوں کے جوہر سنجابی میں بھی سخت اختلاف پایا جاتا ہے جو سنجابی قوت ادراک کا نقطہ اور مرکز ہے۔ اس لیے یہ اختلاف کوئی معمولی اختلاف نہیں ہے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب۔ ممکن ہے کہ ایک شخص ان تمام تشریحی دلائل کو دیکھ کر یہ اعتراض کرے کہ جو دماغی اختلاف تم نے ثابت کیا ہے وہ نتیجہ ہے مردوں کے تسلط، جبر، ظلم اور بے رحمی کا۔ ایک زمانہ دراز سے عورتیں غلامی میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ اور تہذیب و شائستگی تعلیم و تمدن سے (جو عقلی نشو و نما کا باعث ہوتے ہیں) قطعی محروم ہیں۔ اگر ان کو ایک طول طویل زمانے تک اس امر کا موقع دیا جائے کہ مردوں کی طرح تعلیم و شائستگی حاصل کریں اور قوائے عقلی کے زنگ کو دور کریں تو کیا عجب ہے کہ ان کے دماغی قوے ترقی کر کے مردک قوے کے مساوی ہو جائیں اور وہ ضعف جو ان دونوں جنسوں میں مابہ الامتیاز قرار دیا جاتا ہے۔ مفقود ہو جائے۔ چنانچہ قاسم امین بک نے بھی اس اعتراض کو پیش کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ:۔

اس میں شک نہیں کہ آج کل عورت مرد سے ہر حیثیت میں کم نظر آتی ہے لیکن ہم کو غور کرنا چاہیئے کہ یہ اس کا طبعی اور خلقی ضعف ہے یا تربیت کی خرابی اور مدت کی غلامی نے اس کو اس ادنیٰ حالت تک پہنچا دیا ہے؟

پھر یورپ کے دو مصنفوں کے اقوال سے استشہاد کیا ہے۔ چنانچہ لاربٹ پروفیسر فزیالوجی لکھتا ہے

محض ان آثار اور نتائج کی بنا پر جو اس وقت تک عورت کے متعلق دریافت ہوئے ہیں۔ اس کی طبیعت کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی ہے اگر عورت بھی اپنی فطری آزادی سے اسی طرح منتفع ہو جس طرح مرد اپنی آزادی کے مالک ہیں، اور عورت کو بھی اپنے عقل و شعور کی ترقی کے لیے اتنی مدت دی جائے جتنی مدت مرد نے اپنی عقل نشو و نما کے لیے صرف کی ہے تو اس وقت بے شک کسی قسم کا صحیح فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

پروفیسر مے تن جارو لکھتا ہے کہ:۔

سب سے بڑا فرق جو مرد اور عورت کے دماغی قویٰ میں پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ وہ حالتِ غلامی ہے جس میں ایک زمانۂ دراز سے عورت گرفتار ہے عام طبیعتیں ممکن ہے کہ ان اقوال کے رعب میں آ جائیں۔ لیکن ہم پر ان کا جادو کارگر نہیں ہو سکتا۔ فزیالوجی اور سائیکالوجی کے محققانہ اصول پیشِ نظر ہیں اور وہ ثابت کر رہے

ہیں کہ یہ اعتراض بھی مدافعت کے لیے کافی نہیں۔

اوّل تو وہ قومیں جو زمانہ دراز سے حالت وحشت میں زندگی بسر کر رہی ہیں اور جن کا ایک بڑا حصہ دنیا کے مختلف حصوں میں اب بھی موجود ہے اس اعتراض کی غلطی پر شاہد ہیں۔ ان میں اگر تعلیم اور تمدن نہیں ہے تو کسی ایک جنس ہی میں نہیں ہے بلکہ مرد اور عورت دونوں میں نہیں ہے ان میں اگر وحشت پائی جاتی ہے تو صرف عورتوں ہی میں نہیں پائی جاتی بلکہ مرد اور عورت دونوں میں پائی جاتی ہے۔ پھر اگر یہ اعتراض صحیح ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ یہ جسمانی اور دماغی فرق متمدن ممالک کی طرح ان میں باہم پایا جاتا ہے کیا افریقہ کی وحشی قوموں نے بھی عورتوں کو تعلیم اور شائستگی سے محروم کر رکھا ہے۔ کیا وحشت کے ساتھ ان میں یہ امتیاز پایا جاتا ہے؟

دوم یہ کہ اگر یہ اختلاف مردوں کے تمدنی مشاغل میں عدم مشارکت کا نتیجہ ہے۔ اور اس پر مبنی ہے کہ عورتوں کو مردوں کے تسلط سے آزادی نہیں نصیب ہوتی تو سوال یہ ہے کہ وحشی اقوام میں یہ فرق کس بنا پر پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ممالک حارہ کی رہنے والی وحشی اقوام میں مردوں کی طرح عورتیں بھی بالکل آزاد اور مستقل ہیں یہاں تک کہ تمام خارجی کام بھی مثل زراعت اور آبپاشی وغیرہ کے عورتیں ہی کیا کرتی ہیں۔ پھر متمدن ممالک کی طرح یہ دماغی اور جسمانی اختلاف ان اقوام میں کیوں پایا جاتا ہے؟ انسائیکلوپیڈیا بھی اس رائے میں ہم سے متفق ہے اس کا فاضل ایڈیٹر پروفیسر دوفارینی لکھتا ہے:۔

> جس طرح مرد اور عورت کے جسمانی اور دماغی قویٰ کا باہمی اختلاف تم کو پیرس جیسے متمدن شہر کے شائستہ باشندوں میں نظر آتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح امریکہ کی وحشی ترین اقوام میں بھی پایا جاتا ہے۔

ایک عجیب بات ہے کہ ادھر تو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ عورتوں کی گذشتہ وحشت نے ان کے جسمانی اور دماغی قویٰ کو ضعیف کر دیا ہے۔ اور ادھر یورپ کے فاضل مصنفین اور عقلا کا یہ خیال ہے کہ تمدن کی ترقی عورت و مرد کے طبعی اختلاف کو زیادہ کر رہی ہے۔ پروفیسر دوفارینی انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے:۔

> "تمدن کے بڑھنے کے ساتھ ہی قدرتی اختلاف کی وضاحت بھی زیادہ ہو جاتی ہے چنانچہ گوری رنگت کے مردوں اور عورتوں میں جو فرق پایا جاتا ہے۔ وہ سیاہ فام رنگت کے وحشی مردوں اور عورتوں کے باہمی اختلاف سے کئی درجہ بڑھا ہوا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ مرد اور عورت کا جسمانی اور دماغی اختلاف ایک طبعی اختلاف ہے جس کی کوئی تاویل

نہیں کی جاسکتی۔ فرض کرلو کہ تشریح اور فزیالوجی کی یہ تمام دقیق بحث سر سے پیر تک غلط ہی ہے۔ یہ بھی تسلیم کرلو کہ گر تفاوت پایا بھی جاتا ہے تو صرف اسی حد تک جس حد تک خارجی اثرات نے عورتوں کو ضعیف کر دیا ہے۔ لیکن اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے کہ حیوانات اور نباتات کی طبعی حالت بھی اس اختلاف کی صاف شہادت دے رہی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ جہاں تک کیمسٹری کی علمی تحقیقات اور تجارب نے پتہ لگایا ہے جمادات بھی اس اختلاف سے محفوظ نہیں۔ عود، خرما، کیلا کے درختوں میں جہاں نر اور مادہ کا امتیاز ثابت ہوا ہے وہاں یہ بھی ثابت ہوا کہ نر درخت کو مادہ درخت پر طبعی قوت کے لحاظ سے فوقیت حاصل ہے۔ حیوانات میں نر کو جو تسلط اور غلبہ اپنی مادہ پر ہوتا ہے اس کے لیے علمی دلائل کی ضرورت نہیں۔ روزانہ مشاہدہ کافی ہے نر اپنی مادہ کی خبرگیری اور حفاظت کرتا ہے حمل کے زمانہ میں اس کو آرام سے رکھتا ہے۔ خود پر اس کو ترجیح دیتا ہے۔ نسبتاً زیادہ محنت کرتا ہے۔ اس سے زیادہ یہ کہ مادہ سے نر کا قد و قامت عموماً زیادہ ہوتا ہے تشریح نے ثابت کر دیا ہے کہ نر کے جسمانی قویٰ خارجی اور داخلی اعضاء مادہ سے بہت زیادہ قوی ہوتے ہیں۔ طب کا محققانہ اصول ہے کہ مادہ کی نسبت نر کا گوشت زیادہ قوی اور زیادہ طاقت بخش ہوتا ہے کیا یہ تمام باتیں اس امر کا بین ثبوت نہیں ہیں کہ مخلوقات میں جنسِ اناث اور رجال کا اختلاف خارجی اثرات کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ خود فطرت نے جسم و دماغ تقسیم کرتے ہوئے عورتوں کو مردوں سے کم حصہ بخشا۔ گذشتہ صفحات میں جو دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ اگر ثبوت دعوے کے لیے وہ کافی نہ سمجھے جائیں تو ابھی اور بیسیوں اختلاف دکھلائے جا سکتے ہیں۔

فزیالوجی کا یہ مسلم اصول ہے کہ انسان کی عقلی قوت و ضعف کا سرچشمہ احمقوں اور بیوقوفوں کا دماغ مشاہیر عقلاء کے دماغ سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ جو لوگ زندگی میں احمق و لایعقل مشہور تھے جب ان کے دماغ کو وزن کیا گیا تو تیس اوقیہ سے کسی حالت میں زیادہ ثابت نہیں ہوا۔ لیکن جن لوگوں کی عقل کی تیزی، ذہن کی سُرعت، خیال کی بلندی عام طور مسلم تھی۔ ان کے دماغ تولے گئے تو ساٹھ اوقیہ سے بھی وزن میں متجاوز ثابت ہوئے۔ یہی قوائے عقیلہ کا سرچشمہ ہے جس میں مرد کا پلّہ عورت سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔ مرد کے دماغ کے وزن کا اوسط عام طور پر ۴۹½ اوقیہ ہے اور عورت کے دماغ کا وزن صرف ۴۴۔ دو سو اٹھتّر مردوں کے دماغ وزن کیے گئے تو سب سے بڑے دماغ کا وزن ۶۵ اوقیہ اور سب سے چھوٹے دماغ کا وزن ۳۴ اوقیہ ثابت ہوا لیکن جب دو سو اکانوے دماغ عورتوں کے وزن کیے گئے تو سب سے زیادہ وزنی دماغ ۵۴ اوقیہ کا اور سب سے کم وزنی دماغ ۳۱ اوقیہ کا نکلا۔ کیا یہ اختلاف اس امر کا بین

ثبوت نہیں ہے کہ عورتوں کے عقلی قویٰ مردوں کے قویٰ سے بدرجہا ضعیف ہیں۔ دماغ جو قویٰ عقلیہ کا منبع
مرکز ہے جب اس کا یہ حال ہے تو پھر عورتوں کا یہ دل گردہ کہاں کہ وہ مردوں کی برابری کا دعویٰ کر سکیں۔

جو لوگ یورپ کی عقلوں سے ممنون و مرعوب ہو چکے ہیں ان کے لیے فی الحال اس باب میں یورپ
کے دو تین قولوں کو پیش کر دینا یہ حکم رکھتا ہے کہ ان کے آگے جاہلیت کا سر نیچا ہو جاتا ہے۔ ان یورپین
راؤں کے پیش کرنے کے بعد ہم اس کی بھی قلعی کھول دیتے ہیں۔

ہم نے جو اقوال پیش کیے ہیں وہ ان لوگوں کے ہیں جو آج یورپ میں مشاہیر فلاسفہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔
ہم نے جابجا انسائیکلوپیڈیا کے اقوال سے استشہاد کیا ہے اور انسائیکلوپیڈیا عموماً تمام یورپ کا اٹھارویں اور انیسویں صدی
کے اعاظم اور کبار علماء کی رایوں کا خلاصہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں شاذ و نادر جو بعض قول وہ نسبت
رکھتے ہیں جو قول آحاد کو جمہور کی رائے سے ہوتی ہے۔

عورت میں اس تمام تشریحی ضعف کے ساتھ انفعال اور ہیجان کی قوت مرد سے بہت زیادہ
ہے۔ اس کے دماغ میں احساس اور تہیج کے مرکز مرد کے دماغ کی نسبت زیادہ بہتر ترکیب رکھتے ہیں۔
اور یہی ایک ایسی چیز ہے جس میں عورت کا پلہ مرد سے بڑھا ہوا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس قوت سے بھی
عورت کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی کیونکہ ہیجان اور احساس کی زیادتی کا نتیجہ یہ ہے کہ عورت عقلی درجے میں
اور زیادہ ناکام ہو گئی ہے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا میں یہ واقعہ دو فقروں میں لکھا ہے:

یہ اختلاف ان دونوں جنسوں کے خواص کی تمیز سے بالکل مطابق ہے۔ مرد میں زیادہ فہم
اور ادراک کا مادہ زیادہ ہے۔ اور عورت میں انفعال اور ہیجان کا جذبہ بڑھا ہوا ہے۔

ایک اور مشہور مصنف علامہ نرومیہ ہیجان کی زیادتی سے عورت کے طبعی ضعف پر استدلال کرتا ہے۔ اس کے
اصلی الفاظ یہ ہیں:

عورت کے عصبی ضعف کا یہ نتیجہ ہے کہ تم اس کے مزاج میں مرد کی نسبت زیادہ ہیجان پاتے
ہو۔ اور اس کی توجیہ سے اپنے عصبی فزیالوجی کی وضع اور منشاء کی طرف اس کو ضعف قسم

لہ التوضیح فی اصول التشریح صفحہ ۴۰۰۔ کتاب مذکور ڈاکٹر جارج پوسٹ پروفیسر تشریح و فزیالوجی کی مستند تصنیف
ہے۔ جدید تشریح میں اس سے بہتر کوئی کتاب عربی میں نہیں لکھی گئی۔ پہلی مرتبہ مصر میں چھپی پھر ترمیم و ترتیب کے بعد
بیروت سے شائع ہوئی۔ بیروت کا ایڈیشن پیش نظر ہے۔

کی تکلیفوں اور خطروں میں ڈال دیتی ہے۔

راز درونِ پردہ ز رندانِ مست پرس
کیں حال نیست صوفیِ عالی مقام را

یورپ کی جدید تشریحی تحقیقات اور علم فزیالوجی نے ثابت کر دیا ہے کہ مرد اور عورت بہ لحاظ صنف کے برابر ہیں۔

آزادیٔ نسواں کی حامی پارٹی نے اِس وقت تک جس قدر دلائل پیش کیے ہیں اگر ان کی تحلیل کی جائے تو آخر میں صرف یہی عروۃ الوثقیٰ دلیل رہ جائے گی جو اوپر کی دو سطروں میں محدود کر دی گئی ہے۔

اگر تمہارے دوستوں میں کوئی شخص پردہ کا مخالف اور آزادی کا حامی ہے۔ اگر کبھی اس نئے خیال والے سے تم کو گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا ہے تو اچھی طرح یاد کرو بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا ہوگا کہ یورپ کی نئی تحقیقات نے مرد اور عورت کو جسمی اور عقلی قوت کی ایک سطح پر پہلو بہ پہلو کھڑا کر دیا ہے۔ اس نے نہایت جوش میں مبالغانہ کہا ہوگا۔ کہ مشرق کا یہ قدیم ظالمانہ خیال ہے کہ عورت مرد کی برابری نہیں کر سکتی مگر آج پورے یورپ نے اس غفلت کے پردے کو چاک کر دیا اور عورت کی اصلی صورت دنیا کو دکھلا دی۔ اس نے بہت دیر تک مؤثر اور ہنگامہ خیز تقریر کی ہوگی لیکن اس دعوے کے مرکز سے ایک انچ بھی نہ ہٹا ہوگا اس کی تمام تقریر اور تمام دلیلیں ایک تشریح طلب عبارت ہوگی۔ اس کی تفسیر میں وہ کئی گھنٹے سرگرم سخن رہا ہوگا قاسم امین بک نے جب اس عنوان پر قلم اٹھایا تو اس مرکز سے ہٹنے کی جرأت نہ کر سکا۔ المراۃ الجدید اور تحریر المراۃ کی سیر کرو۔ جہاں کہیں مساویانہ حقوق کی فریاد ہے۔ اسی دلیل کے بل پر ہے یہی وہ دعویٰ ہے جس کے آگے پردہ کی حامی جماعت دم بخود ہو کر خاموش ہو جاتی ہے۔ مذہب کا زور دکھایا جاتا ہے تو وہ بھی ناکام ہو کر الگ ہو جاتا ہے۔ یورپ کا قول اور حال زبان کی بے خبری نے چھپا دیا اس لیے اتنی قوت نہیں کہ جستجو کی کوشش کریں اور دعوے کی صداقت کا سراغ لگائیں۔

لیکن ہم پر اس دعوے کا جادو اسی طرح ناکام رہا جس طرح مذہب کا معجزہ مخالف جماعت کے لیے بے سود تھا۔ یورپ کے مشاہیر علماء کی رائیں پیشِ نظر تھیں اس لیے جو کچھ مطلب کا دیکھا پیش کر دیا۔

گذشتہ فصل میں ہم نے اس کا بڑا حصہ نقل کر دیا ہے۔ کیا ممکن ہے کہ اس کے پیش کر دینے کے بعد بھی اس دعوے کا طلسم ٹوٹ کر ہباءً منثورًا نہ ہو جائے۔ کہا جاتا ہے کہ یورپ نے مشرق کے قدیم پردۂ غفلت

کو چاک کر دیا۔ لیکن گزشتہ فصل اپنے سامنے رکھ لو اور منصفانہ کہو کہ جس نے مخالف پارٹی کے تیس برس کے پردۂ
فریب کو چاک نہیں کر دیا؟ علم تشریح، فزیالوجی اور سائیکولوجی کے جلیل القدر علمائے یورپ کے جو اقوال پیش کیے
ہیں کیا ان کے مقابلے میں کسی کی جرأت ہے کہ پھر اس دعوے کا اعادہ کر سکے؟ کیا ان اقوال کے پیش نظر کر دینے
کے بعد بھی اس دعوے میں کچھ جان باقی ہے؟ اگر ہے تو آؤ آج اس کا بھی فیصلہ کر ڈالیں۔

ہمارے دوستوں کو آزادی کا شور مچاتے ہوئے کامل ایک قرن گزر گیا ہے لیکن اس عرصہ میں کسی تعلیم یافتہ
شخص نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ یورپ کی منتخب جماعت کہاں تک ان کی تائید کرتی ہے۔ ہندوستان
کے تعلیم یافتہ گروہ کی عام علمی معلومات سے قاسم امین بک کا دائرۂ علم بہت زیادہ وسیع ہے۔ لیکن گذشتہ فصل
پر ایک نظر ڈال لینے کے بعد کیا تم پر حیرت طاری نہیں ہو جاتی کہ مصر کی اس بلند رتبت، کیونکر اس باخبر
شخص کی قوت سامعہ بے خبر رہی۔ یہ حیرت اور زیادہ بڑھ جائے گی جب تم دیکھو گے کہ تشریح اور فزیالوجی
کی تحقیقات کے علاوہ عورت کے قدرتی فرائض کے متعلق اعاظم اور کبائر علمائے یورپ کی کیا رائے ہے۔
کس طرح وہ عورتوں کو فطرتاً فرائض منزلی کے لیے مخصوص قرار دیتے ہیں۔ اور کس طرح پکار پکار کر کہہ رہے
ہیں کہ عورت کا اپنے قدرتی فرائض سے باہر قدم نکالنا دنیا کی تباہی ہے۔ تمدن کی بربادی ہے اور معاشرت
کے لیے خوفناک شگون ہے۔

قاسم امین بک نے اس دعوے کو جن اقوال ثلاثہ کے ساتھ پیش کیا ہے وہ گذشتہ فصل میں تمھاری
نظروں سے گزر چکے ہیں۔ لیکن ایک اور موقع پر اس سے بھی زیادہ دھوکا دینے والی عبارت میں یہ خیال
ظاہر کیا ہے اور دعویٰ کر دیا ہے کہ یورپ کی تمام علمی جماعت یا تو عورتوں کی موجودہ حیثیت پر قانع ہے
یا موجودہ آزادی سے بھی زیادہ آزادی کی خواستگار ہے۔ لیکن ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو آزادی کا مخالف
ہو۔ اس کے اصلی الفاظ یہ ہیں:-

> اسی بنا پر یورپ اور امریکہ میں جو لوگ انسانی ترقی کے طالب ہیں۔ اس امر کی کوشش کر
> رہے ہیں کہ عورت جس آزادی اور استقلال کے درجہ تک پہنچ چکی ہے، اس سے بھی زیادہ تر
> درجۂ کمال کی طرف ترقی کرے۔ ان کی اصلی غرض دنیا کی اس قدیم جہالت پر جہاد کرنے کی یہ ہے
> کہ انسان کی یہ دونوں صنفیں ایک نظر سے دیکھی جائیں اور ان میں باہم کوئی فرق باقی نہ رہے۔ نتیجہ
> آجکل یورپ اور امریکہ میں دو جماعتیں ہیں جو اس مسئلہ کے متعلق دو مختلف رائیں رکھتی ہیں۔

پہلی جماعت اس آزادی اور حریت کو عورتوں کے لیے کافی سمجھتی ہے جو مغربی عورتوں نے اس زمانے میں حاصل کر لی ہے۔ دوسری جماعت موجودہ حالت پر اکتفا نہیں کرتی اور اس سے زیادہ بہتر حالت کی طلبگار ہے۔ وہ اس کوشش میں ہے کہ عورتیں یہاں تک ترقی کریں کہ ان میں اور مردوں میں کوئی فرق باقی نہ رہے[1]

لیکن صرف اس قدر کہہ دینا کافی نہیں ہے۔ ان لوگوں کے نام پیش کرنا چاہئیں جو موجودہ آزادی پر قانع ہیں یا کامل مساوات کے طلبگار ہیں۔ کیونکہ جو جماعت علم و فضل کے لحاظ سے آج یورپ میں اعلیٰ درجہ کی جماعت تسلیم کی جاتی ہے ان کی تصنیفات موجود ہیں۔ مساوات کا خواستگار ہونا ایک طرف وہ موجودہ آزادی کو ایک خوفناک تمدنی مرض سے تعبیر کرتے ہیں۔

اگر ایک شخص کسی خاص ملک کے متعلق یہ دعوےٰ کرے کہ وہاں کے لوگ فلاں خیال یا عقیدے کو تسلیم نہیں کرتے اور مخاطب کو اس کے تسلیم کرنے میں تامل ہو تو اس کا فیصلہ بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ اس ملک کے اعاظم جلیل القدر علماء کی رائیں اس دعوے کی تصدیق کرتی ہیں یا وہ خیال ان میں بالکل نہیں پایا جاتا۔ ہم نے اسی اصول کو پیش نظر رکھا۔ اور مشہور علمائے یورپ کی ورق گردانی کی۔ ہم پر یہ ثابت ہوا کہ ان کے متعلق یہ دعوےٰ صحیح نہیں۔ ہم نے انسائیکلوپیڈیا کے اقوال پیش کیے جو علوم عصریہ اور علمائے یورپ کی رائوں کا خلاصہ ہے ہم نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آگسٹ کونٹ، پرڈون، ژول سیمان جیسے روسائے فلسفہ اور مستند علماء کی شہادتیں نقل کیں جو آج یورپ میں آسمانِ علم کے آفتاب سمجھے جاتے ہیں۔

قاسم امین بک لکھتا ہے کہ یورپ میں ایسے لوگ موجود ہیں۔ جو عورتوں کی موجودہ آزادی پر قناعت نہیں کرتے اور کلی آزادی کے طالب ہیں۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ صرف اس مسئلہ پر موقوف نہیں۔ یورپ تو دنیا بھر کے متضاد اور عجیب و غریب خیالات کا مخزن ہے۔ یورپ میں وہ لوگ بھی موجود ہیں جو مذہب کے قدیم سلسلے کے مخالف ہیں۔ وہ بھی ہیں جو اباحتِ عامہ کے قائل ہیں۔ اور ہر قسم کی نفسانی خواہشوں اور ارادوں کو جائز قرار دیتے ہیں وہ بھی ہیں جو تمدن و معاشرت کی تمام خواہشوں کو فضول سمجھتے ہیں اور نظام حکومت کے دشمن ہیں۔ وہ بھی ہیں جو روحانیت کے خیال کو ایک خبط اور وحشت بتلاتے ہیں تو کیا اہلِ مشرق پر واجب ہے کہ ہر قسم کی آواز جو سرزمین مغرب سے بلند ہو یا یورپ کی طرف منسوب ہو اس کے آگے اطاعت اور تسلیم کا سر جھکا دیں؟

---

[1] المرأۃ الجدیدۃ قاسم امین بک ۱۲

یورپ میں بہ خیال کے لوگ موجود ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کونسی جماعت علم و فضل کے لحاظ سے سربرآوردہ اور قابلِ اعتماد و استناد بھی جاتی ہے کس گروہ کا قول علم اور عقل کے معیار پر ٹھیک اترتا ہے ؛ ہم نے ان لوگوں کے اقوال منتخب کیے ہیں جن کو ملک نے موجودہ مدنیت کا مجدّد، فلسفۂ حسّی کا افضل ترین عالم اور علوم عصریہ کا اعلیٰ ترین معلم تسلیم کر لیا ہے جن کا قول علم و عقل کے موافق ہے۔ ان کے مقابلہ میں اگر چند غیر مستند لوگوں کے اقوال پیش بھی کیے جائیں تو ان کا کوئی اثر ہماری طبیعت قبول نہیں کر سکتی۔
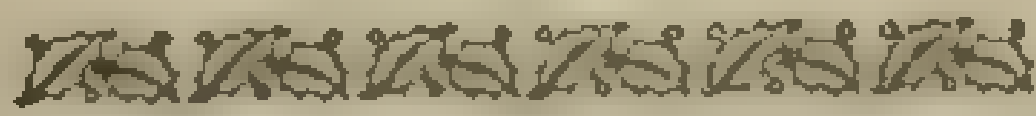
عورتوں کی آزادی اور فرائض کے متعلق علمائے یورپ کا فیصلہ

قدرت نے نظامِ تمدن کے دو حصے کر دیئے ہیں "فرائضِ منزلی" اور فرائضِ تمدنی"۔ پہلا کام عورت کے ذمے قرار دیا اور اس کو ربۃ العائلہ بنایا دوسرا کام مرد کے متعلق کیا اور اس کو تمدنی مملکت کا "تاجدار" بنایا۔ اس لیے درحقیقت قدرت نے مرد اور عورت کو دو علیحدہ جنسوں میں منقسم نہیں کیا بلکہ انسانی ضرورتوں پر نظر رکھتے ہوئے دونوں کی مجموعی طاقت کو شخصِ کامل کی صورت میں مخلوق کیا ہے۔ مرد میں بذاتہ متعدد نقص ہیں جو کامل نہیں ہو سکتے اگر عورت شریکِ حال نہ ہو۔ اسی طرح عورت میں بہت سے نقص ہیں جو مکمل نہیں ہو سکتے اگر مرد اس کی امانت سے دستبردار ہو جائے اس بنا پر مرد اور عورت عبارت ہیں ایک نوع کامل سے جن کی کوشش اور فرائض کی انجام دہی سے نظامِ تمدن قائم ہے۔ جو لوگ اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ عورت کو درجۂ استقلال حاصل ہو جائے ان کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہے جو آکسیجن اور ہیڈروجن کی مجموعی طاقت کو ضائع کرنا چاہے اور اس خبط میں مبتلا ہو کر ان میں سے کوئی ایک عنصر مستقل ہو جائے۔ حالانکہ اس کو معلوم ہے کہ پانی عبارت ہے ان دونوں کی ترکیبی اور مجموعی قوت سے۔ اگر یہ ممکن ہے کہ ان دو میں سے ایک عنصر دوسرے عنصر کی اعانت سے مستغنی ہو کر درجۂ استقلال حاصل کرے اور پانی کی طبعی تکوین میں بھی فرق نہ آئے۔ تو یہ بھی ممکن ہے کہ عورت مرد کے مشاغل میں شریک ہو جائے اور نظامِ تمدن بھی متزلزل نہ ہو۔ لیکن ہم کو معلوم ہے کہ ایسا ہونا محالِ قطعی ہے جس طرح ہیڈروجن کے مقابلہ میں آکسیجن ثقل میں زیادہ ہے۔ اسی طرح عورت کے مقابلہ میں مرد کی جسمی اور دماغی قوت زیادہ ہے جس طرح ہیڈروجن کے ثقل کی زیادتی پانی کی طبعی تکوین کی مخالف ہے۔ بعینہٖ اسی طرح عورت کا استقلال نظامِ تمدن اور معاشرت کی تشکیل کے لیے سمِ قاتل ہے۔

علومِ مادیہ کا افضل ترین عالم یورپ کا سربرآوردہ مصنف ژول سیمان اپنے ایک مضمون میں جو "ریویو

آف ریویوز" میں شائع ہوا تھا۔ اور جس میں ایک فرانسیسی عالم لوزویہ کی تصنیف پر ریویو کیا تھا۔ لکھتا ہے :۔

عورت کو چاہیئے کہ عورت رہے۔ ہاں ! مینک ! عورت کو چاہیئے کہ عورت رہے۔ اسی میں اس کے لیے فلاح ہے اور یہی وہ صفت ہے جو اس کو سعادت کی منزل تک پہنچا سکتی ہے۔ قدرت کا یہ "قانون" ہے۔ اور قدرت کی یہ ہدایت ہے۔ اس لیے جس قدر عورت اس سے قریب تر ہو گی اس کی حقیقی قدر و منزلت بڑھے گی۔ اور جس قدر دور ہو گی اس کے مصائب ترقی کریں گے .... بعض فلاسفہ انسانی زندگی کو .... پاکیزگی سے خالی سمجھتے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ انسان کی زندگی دلفریب پاک اور بیحد پاکیزہ ہے۔ بشرطیکہ ہر مرد اور ہر عورت اپنے ان مدارج سے واقف ہو جائے جو قدرت نے اس کے متعلق کر دیئے ہیں۔

تم کو حیرت ہو گی کہ یہ عظیم الشان فلاسفر عورت کو عورت رہنے کی تعلیم کیوں دیتا ہے ؟ حالانکہ کوئی عورت اپنے جنسی دائرے سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی۔ عورت عورت ہے اور مرد مرد۔ مگر یہ حیرت رفع ہو جائے گی۔ جب تم کو معلوم ہو گا کہ عقلائے یورپ یورپ کی عورتوں کو عورت تسلیم نہیں کرتے۔ کیونکہ درحقیقت انہوں نے اپنے جنسی فرائض بھلا دیئے ہیں۔ اور اپنے طبعی دائرے سے باہر قدم نکالنا چاہتی ہیں۔ یہی عالم ایک اور موقع پر لکھتا ہے :۔

جو عورت اپنے گھر سے باہر کی دنیا کے مشاغل میں شریک ہوتی ہے اس میں شک نہیں کہ وہ ایک سالِ لبید کا فرض انجام دیتی ہے مگر افسوس ہے کہ عورت نہیں رہتی۔

مشہور مصنف پروفیسر جیوم فریرو نے (جو اطوار انسانی کا مشہور نقاد ہے) ۱۸۹۵ء میں ایک مضمون لکھا تھا جو "ریویوز" میں شائع ہوا اس مضمون میں نہایت درد انگیز الفاظ میں ان عورتوں کی افسوسناک حالت کی تصویر کھینچی ہے جو یورپ میں موجودہ آزادی سے متاثر ہو کر مردوں کے مشاغل میں شریک ہو گئی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ :۔

ان عورتوں کو "معاشرت" کے اصلی اصول "زوجیت" سے سخت نفرت ہے۔ قدرت نے جس غرض سے ان کو مخلوق کیا ہے اور جس کام کے لیے ان کو جسمانی اور دماغی اعضاء عطا کیے ہیں۔ اس کو بالکل فراموش کر دیا ہے۔ ان میں وہ طبعی حاسہ اور جنسی امتیاز بالکل نہیں پایا جاتا جو ان کی ہم عمر عورتوں میں فطرتاً موجود ہے۔ ان کی حالت ایک ایسے درجہ تک پہنچ گئی ہے

جس کو "مالیخولیا" سے تعبیر کرنا چاہیے۔ درحقیقت نہ ان کو مرد کہا جا سکتا ہے اور نہ وہ عورت ہیں، بلکہ ایک تیسری جنس کا نمونہ بن گئی ہیں۔ اگر وہ مرد اس لیے نہیں ہیں کہ مردوں سے طبعاً اور ترکیباً مختلف الجنس ہیں تو عورت بھی اس لیے نہیں ہیں کہ ان کا عمل اور وظیفہ فرائض نسوانی سے بالکل مختلف ہے۔ علمائے یورپ اس عظیم الشان نقص مدنیت پر غور کر رہے ہیں جو قوانینِ قدرت کے منافی اور اس کے حدود کو توڑنے والا ہے۔ اگر عورتوں کی یہ افسوسناک حالت اسی طرح کچھ عرصہ تک قائم رہی تو سمجھ لینا چاہیئے کہ عنقریب سوسائٹی میں ایک عظیم الشان خلل پیدا ہونے والا ہے جو تمدن اور معاشرت کی بنیادوں کو متزلزل کر دے گا۔

حیرت ہے کہ حریت کے طلبگار عورت کی غلامی کی فریادوں سے کنگورۂ عرش کو ہلانا چاہتے ہیں، مگر اس پر غور نہیں کرتے کہ قدرت نے مرد کو عورت کا کس طرح محکوم اور غلام بنا دیا ہے؛ قدرت نے مرد کا فرض قرار دیا ہے کہ عورت کے تغذیہ اور آرام و راحت کے لیے آپ کو تمدن کی مہلک موجوں میں ڈال دے اور جانکاہ صدمات برداشت کرے سمندر کی تہ تک پہنچے اور موتیوں کا خزانہ نکال کر عورت کے قدموں پر ڈال دے۔ اس سے زیادہ حیرت یہ ہے کہ عورت کے فرضی وکیل اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ خود عورت کو اپنی طبعی ضروریات کا کفیل ہونا چاہیئے اور مردوں کے مشاغل میں شریک ہو کر آپ کو سیاست اور تمدن کے مناقشات میں مبتلا کر دینا چاہیئے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عورت پر یہ ظلم اور بے حد ظلم نہیں ہے کہ ایک طرف فرائض منزلی اور بقائے نوع انسانی کا اس کو ذمہ دار قرار دیا جائے اور دوسری طرف تحقیقِ جرائم اور تلاشِ معاش کا بھی اس پر بار ڈالا جائے؛ کیا یہ غلامی نہیں ہے کہ مرد اپنا کام بھی عورتوں کے سپرد کر کے طبعی فرائض کی انجام دہی سے سبکدوش ہو جائیں اور عورت کو فرائض منزلی کے ساتھ تمدن اور سیاست کے انتظام و اہتمام کا بھی ذمہ دار قرار دیں؛ غور سے دیکھو انصاف یہ ہے کہ عورت کو اس کے فرائض طبعی کے میدان میں آزاد اور حرمطلق چھوڑ دیا جائے اور وہ اس کام کو اطمینان اور راحت کے ساتھ انجام دے جس کی صلاحیت اور قدرت فطرت نے اس کو عطا فرمائی ہے۔ ساتھ ہی اس کشمکش سے محفوظ رہے جس کی صلاحیت اور قابلیت سے فطرت نے اس کو محروم رکھا ہے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ اگر تمدنی ترقی اور کمال انسانی کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ عورت استقلال اور عام آزادی کے درجہ تک صعود کر جائے اور مردوں کے مشاغل میں شریک ہو جائے تو اس پر کوئی وجہ نہیں

کہ وحشی ممالک کو دنیا کا اعلیٰ ترین متمدن حصہ نہ قرار دیا جائے۔ وہاں مرد خالی الذہن اور غیر مکلف ہوتا ہے۔ تمام کام صرف عورتیں کرتی ہیں۔

درحقیقت خود قدرت اس الزام کی ذمہ دار ہے کہ کیوں عورتوں کو نظامِ تمدن میں کافی حصہ نہیں دیا۔ عورت کی فطرت داخلی اور خارجی اعضائے سر سے پیر تک کی مجموعی ہیئت صاف صاف بتلا رہی ہے کہ وہ اس کام کے لیے ہرگز مخلوق نہیں کی گئی ہے جس کو عورت کے فرضی وکیل اس کے لیے تجویز کر رہے ہیں۔ یورپ کے وہ عالم جو فلسفۂ حسی کے مجدد، اعلیٰ ترین مصنف اور فلسفۂ جدیدہ کے مسلم ارکان ہیں پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ عورتوں کو گھر سے باہر کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا کام نوعِ انسانی کی حفاظت اور صرف فرائضِ منزلی کو انجام دینا ہے۔ مگر افسوس ع

گوشِ سخن شنو کجا، دیدۂ اعتبار کو

مشہور سوشلسٹ فلاسفر علامہ پرودُن اپنی قابلِ قدر اینکارا لنظام میں لکھتا ہے کہ:۔

عورت کو تمدنِ انسانی میں قدرت نے بالکل حصہ نہیں دیا۔ وہ علم کا راستہ طے کرنا چاہتی ہے مگر علم اس سے مساعدت نہیں کرتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ خوفناک نتائج کے ظہور پذیر ہونے کے ہم متوقع ہیں۔ نوعِ انسانی عورت کی کسی علمی اختراع یا صناعی ایجاد یا اخلاقی اور سیاسی کوششوں کی ہرگز ممنون نہیں ہے۔ وہ علم کی شاہراہ پر بغیر عورت کی مساعدت کے چلی ہے۔ اور اس نے خود ہی حیرت انگیز عجائبات ظاہر کیے ہیں۔ بلکہ مرد ہی ایک اکیلی ذات ہے جو خود بخود اختراع کرتی ہے۔ تکمیل تک پہنچاتی ہے اس پر عمل کرتی ہے۔ اس سے نتائج پیدا کرتی ہے اور عورت کے تغذیہ اور آرام و راحت کا انتظام کرتی ہے۔ فلسفۂ حسی کا موسس اصول "نظامِ تمدن" کا بانی استاذ الاساتذہ "آگسٹ کونٹ" اپنی مشہور تصنیف النظام السیاسیہ علیٰ حسب الفلسفہ الحسیہ میں لکھتا ہے :۔

جس طرح ہمارے زمانے میں عورتوں کی سوشل حالت کے متعلق خیالی گمراہیاں پیدا ہو رہی ہیں اسی طرح تغیر نظام تمدن اور آدابِ معاشرت کے ہر ایک دور میں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ مگر وہ لاز آف نیچر جو جنس محب (عورت) کو منزلی زندگی کے لیے مخصوص رکھتا ہے۔ اس میں کبھی کوئی اہم تغیر واقع نہیں ہوا۔ یہ قانونِ الٰہی درجہ صحیح اور محقق ہے کہ گو اس کی مخالفت میں سینکڑوں باطل

خیالات قائم ہوتے رہے مگر یہ بغیر کسی تغیر یا نقصان کے سب پر غالب آتا رہا ہے۔

انسان پر موقوف نہیں۔ دنیا میں جتنی چیزیں مخلوق کی گئی ہیں سب میں جنسی امتیاز پایا جاتا ہے۔ "قوتِ فاعلہ" اور "قوتِ منفعلہ" کی مشترک حالت دنیا کا نظام تمدن قائم رکھتی ہے۔ اس بنا پر عورت کا استقلال اور تمدنی دنیا کی شرکت یہ مفہوم رکھتی ہے کہ قوتِ منفعلہ سے قوتِ فاعلہ کا کام لیا جائے اور قدرت نے جو نظام مقرر کر دیا ہے اس میں تغیر اور ردّ و بدل کیا جائے۔ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ،

یہی فیلسوف اور موقع پر لکھتا ہے:-

مردوں کے مشاغل میں عورتوں کی شرکت سے جو خوفناک نتائج اور فساد پیدا ہو رہے ہیں ان کا علاج یہی ہے کہ دنیا میں جنسِ عامل (مرد) پر جنسِ محب (عورت) کے جو مادی فرائض ہیں انکی حد بندی اور تعین کر دی جائے۔

مرد پر واجب ہے کہ عورت کے تغذیہ کا انتظام کرے۔ یہی وہ قانونِ طبعی اور "ناموسِ الٰہی" ہے جو جنسِ محب کی اصلی زندگی کو منزلی دائرہ میں محدود کرتا ہے۔ یہی وہ قاعدہ ہے جو ہیئت اجتماعی کے خوفناک اور مہیب اشکال کو احسن اور اکمل کر دیتا ہے۔ یہی وہ قانون ہے جو عورت کو اپنی طبعی جذبات سے ترقی نوعِ انسانی جیسے شریف فرض کی بجا آوری پر آمادہ کرتا ہے۔ پس وہ تمام مادی ترقی اور علمی کمال جو عورت کی موجودہ حالت ہم سے طلب کر رہی ہے "محال قطعی" اور محض ناممکن ہے کیونکہ اس ناموسِ الٰہی اور قانونِ طبعی سے منطبق نہیں ہو سکتی۔ اور چونکہ یہ خواہش ناموسِ الٰہی کے مخالف ہے اور اس کے حکم کو رد کرنا چاہتی ہے۔ اس لیے اس طبعی جرم کے اثر سے سوسائٹی کا کوئی علاقہ اور حصہ محفوظ نہیں رہ سکتا۔

تم جانتے ہو کہ یہ کس شخص کا قول ہے۔ یہ اس شخص کا قول ہے جو علم عمران کا استاذ الاساتذہ اور فلسفۂ حسی کا بانی مبانی ہے اور فلسفۂ حسی وہ علم ہے جس کو نوعِ انسانی کی دماغی ترقی کا آخری زینہ تصور کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اشیاء کی حقیقت پر محسوس باتوں کے لحاظ سے حکم لگانے کا صحیح اور تنہا قانون یہی تسلیم کیا گیا ہے۔

سموئل سمائلس انیسویں صدی کا مشہور عالم اور انگلستان کے جدید تمدنی دور کا مسلم موسس ہے جس کی اخلاقی تصنیفات آج یورپ کے تعلیمی نصاب کا ایک ضروری جزو سمجھی جاتی ہیں۔ یورپ کے تمام افاضل اور علماء شہادت دے چکے ہیں کہ ہم تمام مصنفین میں "سمائلس" اخلاق کا سرخیل اور بزرگ ترین مصنف ہے اس

ے بڑھ کر قبولیت کیا ہو سکتی ہے کہ علمی اور اخلاقی سوسائٹی کی طرح مذہبی سوسائٹی بھی اس کی تصنیفات کو بائبل کا ہم پلہ تسلیم کرتی ہے اور اس الماری کو منحوس سمجھتی ہے جس میں سپنسر کی تصنیفات کو جگہ نہ دی گئی ہو۔ یہی عالی دماغ اخلاق فلاسفر اپنی گرانبہا تصنیف "الاخلاق" میں انگلستان کی آزاد عورتوں کی حالت پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

قدیم اہل روما کے نزدیک "شریف اور" ربۃ العائلہ" عورت کی سب سے زیادہ قابل تعریف اور اعلیٰ درجہ کی قابل مدح بات یہ سمجھی جاتی تھی کہ وہ گھر میں بیٹھنے والی اور گھر سے باہر کی کشمکش سے محفوظ ہے۔ ہمارے زمانے میں بھی کہا جاتا ہے کہ عورت پر جغرافیہ کی تعلیم اس لیے واجب ہے کہ وہ اپنے گھر میں مناسب رُخ اور صحیح سمت میں کھڑکیاں بنوا سکے اور "علم کیمسٹری" کی تحصیل اس لیے فرض ہے کہ جوش کی حالت میں دیگچی کی حفاظت کر سکے۔ کیونکہ لارڈ بائرن باوجود اس میلان اور رغبت کے جو اس کو عورتوں کی طرف تھی یہ رائے رکھتا ہے کہ عورتوں کے کتب خانہ میں "بائبل" اور "طباخی" کی کتاب کے سوا اور کوئی کتاب نہیں ہونی چاہیے۔ مگر یہ رائے عورتوں کے اخلاق اور تہذیب کے لحاظ سے غیر معقول اور ان کی ترقی میں ایک رکاوٹ سمجھی جاتی ہے۔

قدیم اہل روما اور "لارڈ بائرن" کی رائے لکھ کر جس کا درحقیقت وہ مؤید اور حامی ہے عورتوں کی آزادی اور تعلیم کے متعلق یورپ کی عام رائے نقل کرتا ہے اور اس کو ایک "جنون" اور مدنیت کے لیے بے حد مضر قرار دیتا ہے۔

" اس رائے کے مخالف ایک اور رائے ہے جو آج تمام یورپ میں شائع اور عام ہو رہی ہے اہل روما اور لارڈ بائرن کی رائے اگر عورتوں کی تہذیب اور اخلاقی ترقی کے لیے مضر سمجھی جاتی ہے تو درحقیقت اس دوسری رائے کو "دیوانگی" اور "خبط" سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ نظام طبیعت پر منطبق نہیں ہوتی۔ اس رائے کا مقصد یہ ہے کہ عورت کو اس قدر مہذب بنایا جائے اور تعلیم سے آراستہ کیا جائے کہ اس میں اور مرد میں سوائے جنسی امتیاز کے اور کوئی فرق باقی نہ رہے۔ اور حقوق سیاسی و علمی کے لحاظ سے مرد اور عورت بالکل مساوی درجہ میں سمجھے جائیں۔"

قدرت نے مرد کو عورت پر غالب [illegible] عورت کے لیے غلامی [illegible] تو جس طرح سمجھ لو کہ عورت کو اس غلامی سے کبھی نجات نہیں مل سکتی۔ قدرت [illegible] اور [illegible] ہے۔ ہماری تمہاری راؤں پر نظر نہیں رکھتی وہ تمہاری رائے کی تابع ہو کر یوں عورت کو مستقل اور آزاد کر دے؟ جبکہ اس کا استقلال دنیا کے لیے اور دنیا کے تمدن کے لیے ایک خوفناک بربادی ہو۔ اس لیے فضول شور وغل سے دست بردار ہو کر غور اور فکر کی نظر ڈالو۔ دیکھو کہ نظام تمدن میں عورتوں کو کیا مرتبہ دیا گیا ہے؟ دنیا کس درجہ ان کی محتاج ہے؟ اور کس درجہ محتاج ہے۔ خود مردوں کے فرائض کیا ہیں؟ دنیا میں اس وقت تک عورتوں کو کہاں تک تمدن میں شریک کیا گیا؟ اور اب کہاں تک شریک ہیں؟ پھر جو کچھ علم وعقل کا فیصلہ ہو اس پر شاکر ہو کر بیٹھ جاؤ کیونکہ قدرت کے قانون میں تغیر ممکن نہیں۔

مشہور نہلسٹ فلاسفر فیلسوف اعظم علامہ "پروڈن" انتکار النظام میں لکھتا ہے:-

"سوسائٹی کی تکوین درحقیقت ان تین "عنصروں" سے ہوتی ہے۔ علم، عمل، عدالت۔ اب دیکھو کہ مرد اور عورت کا ان عناصر ثلاثہ میں کس درجہ حصہ ہے۔ اور باہم کس قدر متفاوت ہیں۔ نظام تمدن ہم کو بتلاتا ہے کہ علم وعمل وعدالت کے لحاظ سے مرد اور عورت میں وہ نسبت ہے جو ۳ × ۳ × ۳ کو ۲ × ۲ × ۲ سے ہوتی ہے۔ یعنی ۲۷ اور ۸ کی نسبت ہے۔ اس لیے جو لوگ عورتوں کے لیے آزادی اور استقلال کے طالب ہیں۔ وہ درحقیقت عورتوں کو تفاوت کے قید خانے میں مقید کرنا چاہتے ہیں۔ وہ قید خانہ جو مفروضہ "عبودیت" کے قید خانے سے کچھ کم نہیں ہے۔

یہی نہلسٹ عالم ایک اور موقع پر لکھتا ہے:-

چونکہ عورت کو صرف معنوی خوبیاں عطا کی گئی ہیں۔ اس لیے اس حیثیت سے وہ ایک بیش بہا جواہر اور اس صفت میں مرد پر سبقت لے جانے والی ہے۔ عورت کی ان خوبیوں کا ظہور مرد کی ماتحتی میں رہنے سے ہی ہو سکتا ہے کیونکہ عورت کا فرض صرف اتنا ہے کہ وہ اس بے بہا عطیۂ قدرت کو اپنے لیے محفوظ رکھے۔ جو دراصل اس کی مستقل خاصیت نہیں بلکہ ایک ایسی صفت، شکل اور حالت ہے جو اس پر شوہر کی حکومت ماننے کو لازم قرار دیتی ہے۔ پس عورت کا مرد کے ساتھ دعوئے ہمسری کرنا، اس کو نہایت مکروہ اور بدنما بنانے والی بات

ہے۔جس کی وجہ سے وہ تعلقات زوجیت کو توڑنے والی، محبت کو مٹانے والی اور نوعِ انسانی کو ہلاک کرنے والی بن جاتی ہے۔

لطف یہ ہے کہ "قاسم امین بک" اور اس کے ہم خیال حضرات تربیت اطفال کو ایک نہایت اہم فرض قرار دیتے ہیں۔مگر ساتھ ہی آزادی اور استقلال کی فریادیں بھی بلند کرتے ہیں۔قاسم امین بک لکھتا ہے:۔

جمہور کا خیال ہے کہ اطفال کی تربیت ایک معمولی کام ہے جس کو ایک جاہل عورت بھی اچھی طرح انجام دے سکتی ہے۔ مگر جو لوگ فطرتِ انسانی سے واقف ہیں اور علم کے زیور سے آراستہ، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ شئونِ انسانیہ میں سے کوئی کام اس قدر اہم نہیں ہے۔ اور دنیا کے تمام علمی اور تمدنی کاموں میں سے کوئی شے اس قدر دشوار نہیں ہے جس قدر بچوں کی تربیت اور صحیح تربیت ہے۔ انسان کی تمام علمی اور اخلاقی خوبیوں کا دارومدار محض اس تربیت پر ہے جو عالم طفولیت میں ماں کی توجہ سے انسان حاصل کرتا ہے۔ اور انسان کی علمی ترقی اور اخلاقی کمال کا حقیقی سرچشمہ وہ قیمتی زمانہ ہے۔ جب وہ اپنی ابتدائی عمر میں قدرت کے مقرر کیے ہوئے شفیق معلم سے فضل و کمال کے دیباچہ کا درس حاصل کرتا ہے علمی حیثیت سے دیکھو تو تربیت اور صحیح تربیت ان تمام علوم کی محتاج ہے جن کے ذریعہ سے انسان کے جسمانی اور روحانی نشوونما کے قوانین سے واقفیت ہو سکتی ہے۔ محنت اور توجہ کے لحاظ سے تربیت ہی ایک ایسی چیز ہے جس میں بے انتہا صبر اور تحمل کی ضرورت ہے۔ یوم ولادت سے سن بلوغ تک بچوں کی نگرانی کرنا۔ صبر اور تحمل سے اپنی کوشش اور توجہ کے نتائج کا انتظار کرنا اور تقریباً چودہ پندرہ برس کا طویل زمانہ اسی کوشش میں بسر کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔[1]

لیکن سوال یہ ہے کہ جس عورت کے طبعی فرائض میں ایسا اہم اور محتاجِ علوم و مشقت کام داخل ہے۔ کیا وہ دنیا کے سیاسی اور تمدنی ہنگاموں میں بھی حصہ لے سکتی ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ تربیتِ اطفال بے انتہا مشکل اور غیر معمولی توجہ کی محتاج ہے۔ لیکن کیا اس کی اہمیت اور دشواری اس امر کے لیے مستلزم ہے کہ انتظام حکومت اور سیاسی مناقشات کے علاوہ اطفال کا بار بھی مظلوم اور مسکین عورت پر ڈالا جائے؟ تم کہتے ہو کہ عورت کی آزادی مردوں نے چھین لی ہے۔ ظلم و ستم کا عادی بنا دیا۔ لیکن سچ سچ بتاؤ عورت کو تمدن

---

[1] المراۃ الجدیدہ قاسم امین بک۔

کی کشمکش سے محفوظ رکھنا اور اس امر کا موقع دینا کہ فرائض تربیت کی انجام دہی میں منہمک رہے انصاف اور حقیقی انصاف ہے یا تربیت جیسی اہم اور مشکل ذمہ داریوں کے ساتھ سیاسی اور تمدنی انتظام کا بھی ذمہ دار بنانا انصاف اور خالص انصاف ہے؟ تم کہتے ہو کہ ہم انصاف نہیں کرتے مگر ہم کہتے ہیں کہ تم عدالت سے کوسوں دور ہو۔ مرد کے فرائض کا بار بھی غریب عورت کے سر ڈالنا غلامی نہیں ہے مگر عورت کو اس ناواجب اور خلاف احکام قدرت بوجھ سے بچانا ظلم اور انصاف سے بعید ہے تم کہتے ہو کہ تربیت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی کام اہم اور دشوار نہیں۔ پھر کیوں عورت کو اس امر کا موقع نہیں دیتے کہ وہ اس اہم اور دشوار کام کو تعلیم قدرت کے مطابق انجام دے؟ حقیقت یہ ہے کہ تم اگرچہ عورتوں کی "وکالت" کا دعویٰ کرتے ہو مگر تمہاری وکالت غریب عورتوں کے لیے تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ ہم ہیں عورتوں کے حقیقی اور سچے حامی کہ پکار پکار کر ان کو سمجھا رہے ہیں کہ قدرت اور فطرت کے قانون نے تم کو جس دائرے میں محدود کر دیا ہے اے غریب اور شریف عورتو! اس دائرے سے باہر قدم نکالنے کی مجرم مت بنو۔

"قاسم امین بک" نے امریکہ کے ایک چیف جسٹس کا قول نقل کیا ہے اور اس سے استدلال کیا ہے کہ خارجی مشاغل عورت کے منزلی فرائض میں خلل انداز نہیں ہو سکتے۔ اس کے اصلی الفاظ یہ ہیں:-

> عام مشاغل اور گھر سے باہر کی زندگی عورت کے منزلی فرائض پر مؤثر نہیں ہو سکتی۔ وہ مشاغل عمومی میں بھی مشغول رہ سکتی ہے اور ساتھ ہی اس کے منزلی فرائض بھی انجام پا سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اس وقت تک اس قسم کی کوئی خبر نہیں سُنی کہ کوئی شخص اپنی بیوی کا اس لیے شاکی ہوا ہو کہ وہ مصالح عامہ میں بھی شریک ہے[1]

لیکن ہم "قاسم امین بک" سے اس کے ہم خیال مصلحوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا امریکہ کے جج کا قول صحیح ہے کہ تم تربیت اطفال کو ایک مشکل اور محتاج مشقت کام سمجھتے ہو؟ کیا ممکن ہے کہ ایک شخص اوّل الذکر رائے کو صحیح تسلیم کر کے آخر الذکر رائے کی صحت کا بھی اعتراف کرے؟ کیا ممکن ہے کہ دو اور دو پانچ بھی ہوں۔ اور دو اور دو چار بھی؟ جواب کی امید نہیں۔ اس لیے ہم خود جواب دیتے ہیں کہ یہ سب ممکن ہے اگر یہ ممکن ہو کہ فطرت کے قوانین "منسوخ" ہو جائیں۔ اگر یہ ممکن ہو کہ خدا کے قرار دیئے ہوئے فرائض بدل جائیں۔ اگر یہ ممکن ہو کہ مغرب مشرق ہو جائے اور جنوب شمال فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا

---

[1] المراة الجدیدہ فصل پنجم

لَاتَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللہِ۔

قاسم امین بک لکھتا ہے کہ :۔

ابتدائے تخلیق عالم سے اس وقت تک کی مجمل تاریخ عورت کی یہ ہے کہ اس پر چار دور گذرے ہیں۔ دورِ اوّل میں انسان بالکل ابتدائی حالت میں تھا اس لیے عورت حرِّ مطلق اور بالکل آزاد تھی۔ پھر عائلہ کی تشکیل ہوئی عورت کے لیے یہ دوسرا دور تھا۔ اس دور میں اگر استعباد اور مردوں کی غلامی میں مبتلا ہو گئی اور اس کی فطری حریت مردوں نے چھین لی۔ اس کے بعد تیسرا دور شروع ہوا۔ اس دور میں انسانی حالت نے کمال کی طرف ترقی کی اور تمدنی اثر آہستہ آہستہ پھیلنے لگا۔ اس لیے عورت کی غلامی نے ایک کروٹ لی اور اس کے حقوق کی طرف توجہ ہوئی۔ لیکن مرد کی خود غرضی نے پسند نہیں کیا کہ عورت کے جن حقوق کو اس نے تسلیم کیا ہے ان سے فائدہ اُٹھانے کا اس کو موقع دے۔ لیکن چوتھے دور میں جب تمدن درجۂ کمال کو پہنچا اور فطرت کے بخشے ہوئے حقوق پر متمدن انسان کو توجہ ہوئی تو عورت کی حریت نامہ کو مردوں نے تسلیم کر لیا اور مرد اور عورت کا درجہ مساوی ہو گیا۔ یہ ہے عورت کی مجمل تاریخ اور تمدنِ عالم کے ادوارِ اربعہ [1]

فاضل مصنف نے عورتوں کی مجمل تاریخ بیان کر دی مگر یہ نہیں بتایا کہ دورِ اوّل میں وہ کس طرح آزاد تھی؟ اور دورِ دوم میں کس طرح استعباد اور غلامی پر راضی ہو گئی عائلہ کی تشکیل کے ساتھ ہی عورت کا ابتدائی استقلال کیوں مفقود ہو گیا؟ اور کیوں مردوں کی غلامی سے اس نے اپنے آپ کو آزاد نہیں کیا؟ یہ وہ سوال ہیں جن پر غور کرنے کی اگر قاسم امین بک تکلیف گوارا کرتا تو فوراً معلوم ہو جاتا کہ ان میں سے ہر ایک دور کے لیے ایسے اسباب اور لوازم تھے جن سے عورت کسی حالت میں بچ نہیں سکتی تھی۔ لیکن ہم اس بحث سے الگ ہو کر صرف پہلے سوال کو دہرانا چاہتے ہیں کہ دورِ اوّل میں عورت کا کیا حال تھا۔ اور اس کی حریت اور استقلال کی کیا صورت تھی؟ کیونکہ جب دورِ اوّل زمانہ آزادی تھا اور دورِ دوم میں عورت گرفتارِ استعباد ہو گئی اور اب پھر آزادی اور استقلال کی طالب ہوئی تو ہم کو تلاش کرنا چاہیئے کہ دورِ اوّل میں عورت کی کیا حالت تھی؟ تاکہ معلوم ہو جائے کہ اب پھر اسی حالت کو تم عورتوں کے لیے پسند کرتے ہو۔ انیسویں

[1] المرأۃ الجدیدہ فصل سوم

صدی کی انسائیکلوپیڈیا کا مصنف لکھتا ہے :-

"یہاں سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کا پہلا زمانہ وہ تھا جب عائلہ کی بنا نہیں پڑی تھی ۔ اور عورت تمام قیود سے آزاد اور استقلال کے آخری درجے تک پہنچی ہوئی تھی ۔ مگر استقلال کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کی حالت انتہائی درجہ کی حقیر اور ذلیل تھی اور اس کی بے حد اہانت کی جاتی تھی لیکن جب عائلہ کی بنیاد پڑی تو عورت کی حالت میں تغیر ہوا اور بالکل نئی قسم کی حالت شروع ہو گئی کیونکہ عائلہ کے دائرے میں قدم رکھتے ہی درجۂ استقلال سے یکایک گر پڑی اور تقیدات میں مبتلا ہو گئی ۔ مگر اس کے مقابلہ میں ایک معنوی درجہ اس نے حاصل کیا جو اس سے پیشتر مفقود تھا :"

اس سے معلوم ہوا کہ عورت دورِ اوّل میں اگرچہ آزاد اور مستقل تھی لیکن اس کی حقیر حالت اور ذلت یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ جس سے زیادہ حقارت اور ذلت نہیں ہو سکتی ۔ پھر عائلہ کی تشکیل سے استقلال مفقود ہو گیا ۔ لیکن ایک ایسا معنوی درجہ حاصل کیا جو اس سے پیشتر اس کو میسر نہ تھا ۔ عورتوں کے "فرضی وکیل" اس کوشش میں ہیں کہ پھر آزادی اور استقلال کے درجے پر عورت کو صعود کرا دیا جائے جس کا صاف مفہوم یہ ہے کہ عورت کو معنوی درجہ چھوڑ کر ذلت اور حقارت کا درجہ حاصل کرنا چاہیئے ۔ پس اگر یہ خیال صحیح ہے تو ہم سدِ راہ ہونے کی تکلیف گوارا نہیں کرنا چاہتے ۔ قدیم "وحشت" اور "حیوانی حالت" کا شوق ہے تو چھوڑ دو "مدنیت" کو یا دوسرے لفظوں میں ترک کر دو "انسانیت" کو اور پھر عورت کو اس "وحشت" کے میدان کی سیر کرا دو ۔ جس سے آزاد ہو کر اس نے معنوی درجۂ کمال و مدنیت حاصل کیا تھا ۔

اسلام اور اسلام کی خاص مدنیت نے عورتوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ایک مصنف مورخ کی نظر سے پوشیدہ نہیں ۔ آج یورپ میں حدِ اعتدال سے گزری ہوئی آزادیٔ نسواں نے جو نتائج پیدا کیے ہیں ان کو دیکھ کر یورپ کے افاضل وہی طریقہ اختیار کرنا چاہتے ہیں جو اب سے تیرہ سو برس پیشتر "اسلام" نے دنیا کو بتلایا تھا کہ اگر مسلمان اسلام کے مجموعۂ تعلیم و ہدایت میں عورتوں کی حریت یا عدم حریت کے مناقشہ کا قولِ فیصل تلاش کریں اور ڈھونڈیں کہ اسلام نے عورت کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے ۔ کہاں تک اس کو آزادی دی ہے ۔ کس درجہ تک اس کے حقوق تسلیم کیے ہیں ؟ غلامی اور مفرط آزادی کی خرابیوں کا کیونکر علاج کیا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی تعلیم سے مستغنی ہو جائیں ہمارے رسالے کا "موضوع" اس بحث میں قدم نہیں رکھ سکتا ورنہ ہم دعوے کے ساتھ اسلام کے فیصلے کو پیش کرتے اور بتلاتے کہ دنیا کے تمام بنات

ہوئے قانون اور انسان کے تمام بنائے ہوئے طریقے اس الٰہی اور روحانی قانون کے آگے ہیچ ہیں۔ مگر یہاں ہم صرف اتنا بتلانا چاہتے ہیں کہ اسلام نے اس محتاج عورت کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے جس کا شوہر دنیا سے کوچ کر چکا ہو۔ اور کوئی محافظ اور کفیل نہ ہو۔ کیا اس کو گھر سے باہر کی زندگی میں قدم رکھنا چاہیئے۔ اور کیا اس کو اپنی معاش کا انتظام خود اپنے ہاتھوں انجام دینا چاہیئے یا اس کے لیے کسی دوسری صورت کا انتظام ہونا چاہیئے؟

درحقیقت یہ ایک ضروری سوال ہے۔ "قاسم امین بک" نے بھی اس کو پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "اس صورت میں عورت گھر سے باہر نکل کر اپنی ضروریات کے انتظام کرنے پر مجبور ہے۔ اور لا محالہ اس کو آزادی اور استقلال کی اجازت دے کر منزلی دائرے میں محدود رہنے کے قانون کو توڑنا پڑے گا" اسلام نے اس سوال کا جو جواب دیا ہے وہ آج ہم یورپ کے مشہور عقلا کی زبانی سن رہے ہیں۔ "اسلام" کی تعلیم یہ ہے کہ اس قسم کی محتاج اور لاوارث عورتوں کی ضروریات کا انتظام مسلمانوں کو "بیت المال" سے کرنا چاہیئے بیت المال مسلمانوں کا مشترک فنڈ ہے۔ جو امیر وقت کی نگرانی میں ہمیشہ اس قسم کے محتاجوں کی مدد کے لیے تیار رہتا ہے۔ پس "اسلام" میں سوسائٹی یا قوم پر محتاج عورتوں کی امداد واجب کر دی گئی ہے۔ تاکہ معاش کی ضرورتوں سے مجبور ہو کر عورت کو منزلی دائرت سے باہر قدم نہ نکالنا پڑے۔ یورپ کے دانشمند اب بر آج اسی تعلیم پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ گورنمنٹ ان عورتوں کے نفقات کا انتظام قومی فنڈ سے کر دے۔ علامہ "اگسٹ کونٹ" "انتظام السیاسی" میں لکھتا ہے:-

> شوہر یا کسی اور قریبی رشتہ دار کی عدم موجودگی میں سوسائٹی کا فرض ہے کہ عورت کی ضروریات کا اپنی دولت سے انتظام کرے تاکہ معاش کی ضرورت سے مجبور ہو کر گھر سے باہر کی زندگی میں آپ کو مبتلا نہ کرنا پڑے کیونکہ حتی الامکان عورت کی زندگی کو منزلی دائرے میں محدود رہنا چاہیئے اور ہماری کوشش ہونی چاہیئے کہ عورت کی خارجی زندگی کے مصائب اور تکلیفوں سے محفوظ رہے اور قدرت نے اس کو جس دائرے میں محدود کر دیا ہے۔ اس سے باہر نکلنے پر مجبور نہ ہو۔

ہم مانتے ہیں کہ عورت محض غلامانہ زندگی بسر کرنے کے لیے مخلوق نہیں ہوئی قدرت نے اس کو ایک خاص حد تک آزادی عطا فرمائی ہے۔ اور اُس کا فرض ہے کہ اس معتدل آزادی کے حاصل کرنے کے لیے مرد کا مقابلہ کرے مگر اس ہتھیار سے نہیں جو اس کے "دوست نما دشمن" دور سے اس کو دکھلا رہے ہیں اور جو تمدن

ومعاشرت کے میدانِ کارزار میں ہمیشہ اس کو ناکام رکھنے والا ہے۔ بلکہ اس عظیم الشان سلاح سے جو قدرت نے خاص طور پر اس کو مرحمت فرمایا ہے اور جس کے مقابلے میں مرد کی طاقت سے باہر ہے کہ وہ ویسے ہی ہتھیاروں سے مدافعت کر سکے۔ تم جانتے ہو وہ ہتھیار کونسی عظیم الشان قوت ہے؟ ہاں تم گزشتہ فصلیں پڑھ چکے ہو اس لیے سمجھ گئے ہو گے کہ وہ ہتھیار عورت کا اپنے فرضِ منصبی کی ذمہ داریوں سے واقف ہونا اور اپنے قدرتی فرائض کو انجام دینا ہے۔ جس وقت عورت اپنے اس قدرتی سلاح سے کام لے گی تو اس کی حکومت دلوں کی سلطنت پر قائم ہو جائے گی اور وہ انسانی احساسات کی قلمرو کی "ملکہ" بن جائے گی۔ اسکے اختیار میں ہو گا کہ ملکی حکومت کا پانسہ جس طرف چاہے پلٹ دے۔ اس کے ایک اشارے میں شخصی حکومت جمہوری حکومت میں بدل جائے گی۔ اور اس کی ذراسی کوشش سے سوشلسٹ اور جمہوری حکومت کا رخ خود مختار شاہی حکومت کی طرف پھر جائے گا۔ یہ تمام کامیابیاں اس سلاح کی بدولت کیونکر حاصل ہوں گی؟ اس طرح حاصل ہوں گی کہ عورت اپنی خواہش کے مطابق بچوں کی پرورش کرے گی اور ان کے دلوں پر ان خیالات کا نقش۔ نقشِ کالحجر کر دے گی۔ یہی بچے جوان ہو کر ان خیالات امثال کو اپنا نصب العین بنائیں گے اور بڑی بڑی سلطنتوں میں انقلابِ حکومت کا باعث ہوں گے۔ انسان کا پہلا مدرسہ شفیق ماں کی گود ہے۔ اس مدرسہ میں زندگی کے جو اصول سکھائے جاتے ہیں اپنی آئندہ زندگی کے لیے انسان انہی کو دستور العمل قرار دیتا ہے۔

یہی ہے عورت کا ہتھیار، اور بدقسمت ہے وہ عورت جو اپنے قدرتی فرائض کو فراموش کر کے ایسے قوی اور عظیم الشان ہتھیار کو اپنے حرماں نصیب ہاتھوں سے کھو دے۔ کیا عورت تمدنی دنیا میں مردوں کی برابری اور ان کا مقابلہ کرنا چاہتی ہے؟ کیا یہ سچ ہے کہ وہ معاشی زندگی کے قدرتی مشاغل سے گھبرا اٹھتی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اب وہ زمانہ بہت قریب ہے کہ جب وہ اپنے تختِ سلطنت سے اتار دی جائے گی اور اس مرکز سے دور کر دی جائے گی جس پر قائم رہنا اس کے ملیے تمام انسانی سعادتوں اور حقیقی آزادی کا مبداء تھا۔

یہ قدرتی سلاح عورت کو اسی حالت میں مل سکتا ہے جب وہ سیکھے کہ ماں بننے کی صلاحیت کیونکر حاصل ہو سکتی ہے؛ وہ اپنے قدرتی فرائض پر نظر ڈالے اور تربیت کے ان اسرار اور عجائبات کا غور سے مطالعہ کرے جو بزدل کو بہادر، بخیل کو صاحبِ کرم، شخصی حکومت کے شیدا کو جمہوری حکومت کا شیفتہ

اور سوشلسٹ حکومت کے عاشق کو خود مختار شاہی حکومت کا فدائی بنا دیتے ہیں۔

"صحیفۂ فطرت" علمی دلائل اور علمائے یورپ کے اقوال بالاعلان دعویٰ کر رہے ہیں کہ عورت خواہ کتنی ہی کوشش کرے اور آسمانِ ہفتم کے تارے توڑ لائے مگر جسمانی اور عقلی قوت کی سطح پر مرد کی برابری نہیں کر سکتی غلطی اور سخت غلطی ہوگی اگر اس دعوے کا یہ مفہوم سمجھا جائے کہ عورت بالفطرت اس لیے کمزور بنائی گئی ہے کہ وہ ہمیشہ دنیا میں زیر دست رہے اور مرد اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھائے۔ عورت کو جس غرض سے دنیا میں مخلوق کیا گیا ہے وہ نسلِ انسانی کی بقا اور اس کی کثرت ہے۔ اس قدرتی فرض کے لحاظ سے اس امر کی ضرورت نہ تھی کہ عورت کو تمدنی دنیا میں زیادہ بلند کیا جاتا۔ اس کام کے لیے مرد مخلوق کیا گیا۔ اور نامعلوم زمانے سے وہ اپنے فرض کو انجام دے رہا ہے۔ عورت کو وہ قوتیں عطا کی گئیں جو اس کے قدرتی فرض کی انجام دہی میں ممد ہیں۔ اور مرد کو جسمانی اور عقلی قویٰ کی وہ طاقت بخشی گئی جو اس کے تمدنی فرائض کی بجا آوری کا ذریعہ ہوں پس اس حیثیت سے دونوں جنسوں کا درجہ "مساوی" ہے اور دونوں نظامِ کائنات میں برابر کا حصہ رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ عورت کا قدرتی فرض اس امر کے لیے مستلزم ہے کہ مرد کے ماتحت رہ کر اس کی معنوی خاصیت نشو و نما پائے اس لیے عورت پر اس کی بہتری اور ترقی کے لیے یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ وہ پوری طرح مرد کے زیر اثر رہے یہی وہ اطاعت اور ماتحتی ہے جس کو اسلام کے "مجموعۂ قوانین" نے ذیل دفعہ میں ظاہر کیا ہے:-

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ — عورتیں مردوں کے زیر اثر ہیں۔

اگر عورت مرد کی اس قدرتی اطاعت کو قبول نہیں کرے گی تو اس کو مجبور منظور کرنا پڑے گا۔ بیرونی زندگی کے جس قدر کاروبار ہیں ان میں ایک کام بھی ایسا نہیں ہے جس میں عورت مرد کا مقابلہ کر سکے اس خطرناک معرکہ میں غلبہ حاصل کرنے کی پہلی شرط جسمانی قوت، جفاکشی اور مختلف آلام و مصائب کو برداشت کرنے کی ہمت اور طاقت ہے۔ اور یہی وہ شرط ہے جس سے عورت کا کچکول خالی نظر آتا ہے۔ دنیا کی قدیم تاریخ کی ورق گردانی کرو۔ تم کو زمانۂ معلومہ کی ابتدا امر سے لے کر اس وقت تک کوئی زمانہ ایسا نہیں ملے گا جس میں عورت مرد کی مطیع و منقاد نہ رہی ہو۔ دنیا میں ہمیشہ مرد کی حکمرانی رہی ہے۔ اور کبھی عورت نے مردوں پر غلبہ نہیں پایا ہے۔ یہ اس امر کا قدرتی ثبوت ہے کہ کارکنانِ قدرت نے عورت کی پیشانی پر سرنوشت اطاعت لکھ دیا ہے۔ کیونکہ "ورڈ آف گاڈ" اور "ورک آف گاڈ" کبھی باہم مختلف نہیں ہو سکتے۔ دنیا کی یکساں

اور غیر متغیر حالت" ورڈ آف گاڈ" کا حکم رکھتی ہے۔ اور مسلسل واقعات لسانِ فطرت بن کر بتلاتے ہیں کہ قدرت کا مقصود کیا ہے۔ پس کون ہے جو لسانِ فطرت کی مخالفت کر سکتا ہے؟

ہاں "خیالی فلسفہ چاہتا ہے کہ قوانینِ قدرت میں تغیر ہو، کمزور زور آور پر غالب آ جائے اور محکوم حکمرانی کی خواہش میں کامیاب ہو۔ مگر قدرت کے اٹل قوانین" بالاتر از عقلِ انسانی" قوت زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ خیالی فلسفہ ہزار کوشش کرے مگر ناکامیابی کا داغ اس کی پیشانی سے محو نہیں ہو سکتا۔ وہ قوانینِ قدرت کے مقابلہ میں ہمیشہ ناکام رہا ہے اور ہمیشہ ناکام رہے گا۔ کیا خیالی فلسفہ نے کمزور قوموں کو طاقتور اقوام کے پنجوں سے چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ کیا ایک طاقتور آدمی سے اس بات کا مطالبہ نہیں کیا کہ وہ کیوں اپنے زیر دست اور کم طاقت بھائی کے ساتھ ہر حیثیت میں مساوی ہونے کے لیے تیار نہیں ہے؟ کیا اس نے دنیا کو اس خیال کی دعوت دینے میں کوئی کسر اٹھا رکھی کہ طاقتور افراد کو "قانونِ مساوات" پر عمل کر کے اپنے اعلیٰ اور افضل مرتبوں کو خیرباد کہہ دینا چاہیئے مگر ان کوششوں کا انجام کیا ہوا؟ "فلسفۂ تاریخ بتلا رہا ہے کہ عالمِ کائنات کے وہ اسرار جن کو حکمتِ الٰہی نے اعمالِ انسانی پر حکمراں بنایا ہے ایک منٹ اور ایک پل کے لیے بھی متغیر نہ ہوئے۔ قوانینِ قدرت کا تسلط اپنی پوری قوت اور طاقت کے ساتھ دنیا پر قائم رہا اور خیالی فلسفہ کے داعی ناکامی کا داغ ناقابلِ عمل فلسفے کی طرح اپنے ساتھ ساتھ قبروں میں لے گئے۔

تم نوعِ انسانی کے چند ضعیف افراد ہو۔ قوانینِ قدرت کے مقابلہ کرنے کی جرأت کرتے ہو تو اپنی قوت کا بھی اندازہ کر لو۔ کیا "قدرت" تمہاری خواہش کی پابند ہے؟ کیا "قدرت" تمہارے اشاروں کے مطابق چلنے پر مجبور ہے؟ صاف صاف بتلاؤ تم نے قدرت کے عجائبات کو کیا سمجھا ہے؟ قدرت دنیا کی آسائش اور انتظام پر نظر رکھے یا تم ایسے چند ضعیف افراد کی خواہش پر؟ عالمِ کائنات جس روش پر چل رہا ہے ہمیشہ اسی روش پر چلے گا۔ اگر تم اس کی روش کو پسند نہیں کرتے تو در و دیوار کی قوت جاذبہ وغیرہ سے اپنے خبط کا علاج کرو۔

قوانینِ قدرت کا نکتہ شناس اور استاذ الاساتذہ علامہ "اگسٹ کونٹ" النظام السیاسی علی حسب الفلسفۃ الحسیہ میں لکھتا ہے:۔

ہم بغیر اس کے کہ عورتوں کی آزادی کے ناممکن الحصول خیالی ہنگاموں کو توڑنے کی تکلیف گوارا کریں نظامِ حقیقی اور قانونِ قدرت کی قدر شناسی کے لیے ہم پر سب سے پہلے اس بات

کا احساس کرنا فرض ہے کہ اگر کسی زمانے میں عورتوں کو وہ مادی مساوات حاصل ہو جائے جس کو اس کے خواہ مخواہ کے ہمدرد اور وکیل طلب کر رہے ہیں تو صرف عورتوں کی اخلاقی حالت کو ہی صدمہ نہیں پہنچے گا بلکہ سوسائٹی کے قیام و انتظام کے لیے عورت کی جو ذمہ داری قدرت نے مقرر کر دی ہے۔ وہ بھی ٹوٹ جائے گی کیونکہ ایسی حالت میں عورت کو روزانہ قوی مزاحمتوں کے پیش آجانے کی وجہ سے اکثر کاموں میں اپنی عاجزی سے تنگ آجانا پڑے گا اور معاشرت و تمدن کے نہایت ضروری اعمال انجام نہ پا سکیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرت کی دلفریبی مصائب اور آلام سے مبدل ہو جائے گی۔ منزلی زندگی کی شیرینی میں تلخی پیدا ہو جائے گی۔ مرد اور عورت کی باہمی اور مشترک محبت کا صاف سرچشمہ مکدر ہو جائے گا اور کشاکش کائنات میں یہ دونوں جنسیں آج جس طرح مل جل کر مسرت بخش زندگی بسر کر رہی ہیں بالکل مفقود ہو جائے گی۔

ہم سے پہلے بھی دنیا میں ایسی قومیں گزر چکی ہیں جن پر اسی قسم کے مہلک خیالات محیط ہو گئے تھے۔ انہوں نے قوانینِ قدرت کی تعلیم سے روگردانی کی تھی اور خدا کے بنائے ہوئے حدود کو توڑنا چاہا تھا۔ مگر ان اقوام کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوسائٹی میں ایسے رنج دہ اور برباد کن نتائج پیدا ہو گئے جنہوں نے ان کو رفتہ رفتہ برباد کر دیا اور اس طرح بے نام و نشان کر دیا کہ آج ہم ان کے وجود سے بھی بے خبر ہیں فلسفہ تاریخ نے اس قسم کے تاریخی شواہد اور گذشتہ امم کے حوادث کو ایک علمی استقرار قرار دیا ہے جس کے پیشِ نظر ہونے کے بعد ممکن نہیں کہ خیالی فلسفہ کی دلفریبی سے طبیعت متاثر ہو۔

علامہ "دوفاریتی" انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے کہ :۔

ہمارے زمانہ میں عورتوں کی خیر خواہی اور ان کی اصلاح کے متعلق جو تحریک شائع ہو رہی ہے یقیناً اس کا انجام یہی ہوگا کہ اس عام تجربے کی تصدیق ہو جائے گی۔ نوعِ انسانی دنیا کے ہر ایک گوشہ میں ایک عرصہ دراز تک ایک ایسے طرزِ معاشرت کی زندگی بسر کرتی رہی ہے جو اس سوسائٹی کی حالت سے بھی زیادہ حقیر اور ذلیل تھی جس کی وجہ سے آج عورتوں کی حالتِ زار پر آنسو بہائے جاتے ہیں۔ مگر قرونِ وسطیٰ سے ترقی یافتہ قوموں کی سوسائٹی بتدریج اس حالت سے نکلنے لگی۔ اور رفتہ رفتہ قدیم ذلت اور حقارت سے پاک ہو

گئی ۔کیونکہ سوسائٹی کی خرابی ایک ایسی عارضی حالت تھی جس کو گذشتہ زمانہ جہالت کے اثرات نے پیدا کر دیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں حاکم اور محکوم کا امتیاز کسی عضوی مسئلہ پر مبنی نہ تھا۔ (یعنی جیسا تعلق مرد اور عورت میں ہے کیونکہ ان دونوں میں باہمی عضویہ اختلاف ہے)

اس کے بعد مرد اور عورت کے باہمی معاشرتی تعلقات کے متعلق لکھتا ہے :۔

مگر مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی اطاعت شعاری ایک ایسی چیز ہے جس کی اور تمام باتوں کے برعکس کوئی حد نہایت نہیں قرار پا سکی ۔ وہ بتدریج عام اخلاقی ترقی کے ساتھ موافقت کرتی رہی کیونکہ اس کا تعلق براہِ راست عورت کے اس طبعی ضعف سے ہے جس کا تدارک ممکن نہیں ۔عورت کی یہ قدرتی کمزوری "علم الحیات" (بائی لوجیا) کے اصول و تجارب اور روزمرہ کے معاشرتی مشاہدات سے ثابت ہو چکی ہے اور اس درجہ مسلم ہے کہ اس سے انکار کرنا اصول علمی سے انکار کرنا ہے ۔"علم الحیات" تشریحی اور فزیالوجی اصول کی بناء پر نہایت وضاحت کے ساتھ بتلاتا ہے کہ حیوانی سلسلہ میں عام طور پر اور انسان میں خاص طور پر مادہ (جنس اناث) کی ترکیب بچوں کی اصلی حالت سے بے حد مشابہت رکھتی ہے ۔اور یہی حالت عورت میں اپنے مدِ مقابل (جنسِ رجال) کی ترکیب عضوی سے کم درجہ رکھتی ہے ۔

نوعِ انسانی کے چند ضعیف اور ذلیل افراد اور فَاطِرُ السَّمٰوٰات کے مقرر کیے ہوئے قانون میں ایک عجیب و غریب لڑائی جاری ہے ۔ یہ ضعیف انسان اس کے بنائے ہوئے قانون کی پرواہ نہیں کرتا ۔اس کو نفرت و حقارت سے دیکھتا ہے اور اس کی مخالفت پر آمادہ ہے ۔ مگر قانونِ قدرت کی مستحکم اور اٹل حکومت عالم کائنات پر محیط ہے ۔ وہ اپنے اصولوں پر قائم ہے اور اپنے مدِ مقابل کی اس حریفانہ جرأت کو بعینہٖ اسی طرح دیکھ کر ہنس رہا ہے جس طرح ایک تجربہ کار بوڑھا کسی شیر خوار بچے کو نیرِ اعظم کی شعاعوں کی مخالفت پر آمادہ دیکھ کر مسکرا دیتا ہے ۔ یہ ضعیف اور اسرار قدرت سے بے خبر انسان عورت کے قدرتی ضعف کو اپنی مادی اور مصنوعی کوشش سے دور کرنا چاہتا ہے اور مرد کا مدِ مقابل بنانا چاہتا ہے مگر قدرت اپنے قانون اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ پر نہایت استحکام اور مضبوطی سے قائم ہے ۔اور اپنے ذلیل حریف کو کوشش اور سعی کے تمام ارمان نکال لینے کا موقع دے رہا ہے ۔ عالمِ کائنات میں ذرّہ سے لے کر عظیم الشان مخلوقات تک کوئی ہستی اس دعویٰ کی جرأت کر سکتی ہے کہ یہ ضعیف انسان قانونِ قدرت کے معاملہ میں

کامیابی حاصل کرے گا؟ کیا کوئی ایک پل کے لیے بھی یقین کر سکتا ہے کہ ضعیف انسان کی کوشش قانونِ قدرت کی حکومت کو متزلزل کر دے گی؟ کون ہے جو ایسا یقین کر سکتا ہے اور کون ہے جو یقین کر کے اپنی دیوانگی اور جنون کا قطعی ثبوت دے سکتا ہے۔ فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ

میڈم ہیرکورٹ کی کوششوں سے علمی دنیا بے خبر نہیں ہے اس نے عورتوں کے حقوق کی حفاظت کا بیڑا اُٹھایا تھا اور مردوں کو دھمکایا تھا کہ عنقریب اس کی کوششیں کامیاب ہو کر غالب کر دیں گی۔ لیکن جب اس نے مشہور سوشلسٹ فلاسفر علامہ پرودھون سے بذریعہ تحریر دریافت کیا کہ مسئلہ حقوقِ نسواں کے متعلق اس کی کیا رائے ہے؟ تو علامہ موصوف نے ایک تفصیلی جواب دے کر اس کے تمام دعووں اور مسائل متعلق کے رد کا مواد نہایت تفصیل سے مہیا کر دیا۔ چنانچہ علامہ مذکور لکھتا ہے کہ:-

میرے خیال میں عورتیں اپنی آزادی کی کوشش کر رہی ہیں۔ یہ ایک نری دیوانگی ہے جو افسوس ہے کہ اس جنس کو لاحق ہو گئی ہے۔ عورتوں کی یہ حالت اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ اب ان میں اپنی قدر پہچاننے اور بذاتِ خاص اپنے معاملات کو انجام دینے کا مادہ بھی نہیں رہا۔

پھر اس کے بعد یہ محترم راز دار قوتِ علمی دلائل سے اپنی رائے کو تقویت دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ:-

عورتوں اور مردوں میں جنسیت کا جو فصل پایا جاتا ہے وہ ان دونوں جنسوں کو مساویانہ صورت میں الگ نہیں کرتا بلکہ باہمی مشابہت کے ساتھ ایک دوسرے کو الگ الگ کر کے قوت وضعف کے اہم اختلافات کو پیش نظر کر دیتا ہے جو حیوانات کی نوعوں اور جنسوں میں پایا جاتا ہے۔ پس اس فصل اور اختلاف کی وجہ سے عورت اور مرد کا ہم شریک بن کر رہنا ناممکن اور محال قطعی ہے یہی وجہ ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ عورت کا وجود مرد کے تعلق سے اثبات وجود کرتا ہے اور خود اس میں اتنی قدرت نہیں ہے کہ مستقل حیثیت سے اپنے وجود کو قائم رکھ سکے عورت کو ہم اگر ملکی اور وطنی سمجھتے ہیں تو صرف اس تعلق کی بنا پر کہ وہ ایک وطنی مرد کی بیوی ہے۔ مثلاً ہم کسی جمہوریت کے پریسیڈنٹ کی بیوی کو اس لیے پہچانتے ہیں کہ وہ پریسیڈنٹ جمہوریت کی بیوی ہے۔ لیکن اس رائے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت دنیا میں محض ایک

بیکار چیز ہے۔ جو عالم کائنات میں کسی قسم کا حصہ نہیں لے سکتی۔ کیونکہ قدرت نے اس کے ذمہ ان کاموں سے زیادہ اہم اور زیادہ باعظمت کام مقرر کر دیئے ہیں جو مرد تمدنی دنیا میں انجام دیا کرتا ہے بلکہ میری اصلی غرض یہ ہے کہ چونکہ تمدنی مشاغل میں شرکت اس کے فرض منصبی کا "نقیض" ہے اس لیے اس کے دماغی اور جسمانی قویٰ کو تمدنی اشغال کے انجام دینے کی طاقت قدرت نے نہیں بخشی۔

اس کے بعد سوشلسٹ فیلسوف نے اپنی تمام رائے کا خلاصہ ذیل کی سطروں میں لکھ کر اس بحث کا خاتمہ کر دیا ہے۔ انتہائی دیوانگی اور جنون کا نمونہ ہے وہ شخص جو ان سطروں سے متاثر نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ میں اس بات پر پوری قوت سے آمادہ ہوں۔ کہ مشاہدات براہین اور تجارب سے ثابت کر دوں کہ جس طرح عورت قوت میں مرد سے بدرجہا کم ہے اسی طرح کاروبار دنیا، اخلاقی میدان اور عالم فلاسفہ میں بھی مرد سے بہت پیچھے پڑی ہے۔ اور قدرت کا مقصود ہی یہی ہے کہ ہمیشہ پیچھے پڑی رہے پس اگر سوسائٹی میں عورت نے وہ اقتدار حاصل کر لیا ہے جس کے لیے تم کوشش کر رہے ہو اور مرد کے مقبوضات میں داخل ہو گئی تو اسے میرے عزیز دوست! اچھی طرح سمجھ لو کہ پھر عورت کا معاملہ حد سے گذر جائے گا اور صاف صاف یہ ہے کہ استعباد اور "غلامی" میں گرفتار ہو جائے گی۔

یا للأسف کیا ایسے قطعی اور علمی احکام کو سن کر بھی تم عورتوں کو آزادی دلانے کی مہلک سعی سے باز نہیں آؤ گے؟ کیا علامہ "پرودن" جیسے نکتہ شناس قوانین الٰہی کی تحریر اس امر کا قطعی ثبوت نہیں ہے کہ فطرۃ اور علم صحیح تمہارے وہمی خیالات کی بالکل مخالف ہیں؟ کیا ابتکار النظام کے جید مصنف نے صاف صاف نہیں کہدیا کہ مساوات حقوق کی کوشش قوانین الٰہی کو توڑنے کی کوشش ہے کون ہے جو جواب نفی میں دے سکتا ہے؟ اور کون ہے جو جنوب کو شمال اور مغرب کو مشرق بتلا سکتا ہے؟ ہاں! بے شک آزادی نسواں اور مساوات حقوق کا خیال قوانین الٰہی کی عظمت کا مقابلہ ہے، تم قوانین فطرت کا مقابلہ کرنا چاہتے ہو مگر افسوس ہے کہ یہ نہیں بتلاتے کہ تم کون ہو اور تمہاری ہستی کیا ہے؟

ہاں ہم کو معلوم ہے کہ تم کون ہو اور تمہاری ہستی کیا ہے؟ تم ذلیل اور ضعیف انسان ہو۔ سرکش ہو اور مغرور ہو، ناقص علم کے نشہ نے تم کو سرشار کر دیا ہے اور خیالی فلسفہ کی غفلت سے تم مدہوش ہو گئے ہو تم سمجھنے

ہو کہ قوانینِ الٰہی کے سمندر کو ہم نے طے کر لیا ہے حالانکہ تم ابھی اس کے کنارے تک بھی نہیں پہنچے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ حقائقِ اشیاء کے لق و دق میدان کا ہم نے کونہ کونہ چھان مارا ہے حالانکہ تم نے ابھی اس کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی۔ "نیوٹن" دریائے علم کے کنارے پر اپنے آپ کو ایک بچہ سمجھتا ہے۔ مگر تم کو وہم و جنون نے یقین دلا دیا ہے کہ تمہارے قدم اس کی تہ تک پہنچ گئے ہیں۔ "بیکن" میدانِ حقائق میں اپنے آپ کو ایک سنگریزہ سمجھتا ہے۔ مگر غرور اور سرکشی نے تم کو اس وہم میں ڈال دیا ہے کہ تمہاری آنکھوں میں اس کے ذرہ ذرہ کا عکس موجود ہے۔ تم اپنی ذلیل اور حقیر ہستی کو بھول گئے ہو۔ اور وہم و غرور کی خوشامد نے تم کو ایک خطرناک دھوکہ میں ڈال دیا ہے آہ تم فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے قوانین کا مقابلہ کرنا چاہتے ہو حالانکہ تمہاری ہستی ضعیف ترین، تمہاری معلومات محدود اور تمہارا علم بالکل ناقص ہے۔ تمہاری مثال عام کائنات کے اسرار و عجائب کے مقابلہ میں (بقول بیکن) بالکل ایسی ہے جیسے نیرِ اعظم کی شعاع کسی ناچیز ذرہ کو درخشاں کر دے اور وہ اپنی چمک سے مغرور ہو کر اس عظیم الشان ہستی سے مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے "علم" ایک فضائے بسیط ہے جس میں ہزاروں اور لاکھوں ستارے موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ تم نے تو ابھی لاکھوں میل کے فاصلہ سے صرف ایک چھوٹے ستارے کی جھلک دیکھ پائی ہے۔ اور اس پر اس قدر مغرور ہو گئے ہو گویا اس فضائے علم کا ذرہ ذرہ تمہارے دماغ میں موجود ہے۔ ابھی لاکھوں ستارے ہیں جن کو نہ تمہاری آنکھوں نے دیکھا ہے اور نہ تمہارا ظرف ان کے باعظمت وجود کے نظارہ کا متحمل ہو سکتا ہے "علم"! "علم"! کے نعرے لگا کر دنیا کی علمی مصروفیت اور ذہنی سکون میں خلل ڈال رہے ہو۔ بتلاؤ تم نے "علم" کس چیز کو سمجھا ہے؟ وہ کونسا "علم" ہے جس نے تم کو سرکش اور مغرور بنا دیا ہے؟ اور وہ کون سے معارف ہیں جن کی نخوت نے تم کو قانونِ الٰہی کی مخالفت کی باغیانہ جرأت دلا دی ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ تم نے "حرارت" کے چند طبعی قوانین کا پتہ لگا لیا ہے۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے "قانونِ کشش" اجسام کو ایک خودراری واقعہ کی بنا پر دریافت کر لیا ہے تو کیا یہی وہ معارف ہیں جن کی دریافت کا غرور تم کو قدرت کے مقابلہ کے لیے تیار کر رہا ہے؟ کیا اسی قسم کی وہ تحقیقات ہیں جن کی وجہ سے تم اپنے آپ کو اسرارِ کائنات کا "محرم" سمجھتے ہو؟ اگر یہ سچ ہے تو تم کو سمجھ لینا چاہیے کہ تمہارے "علم" پر جہل ہنس رہا ہے اور تمہاری معلومات کو بے تہ ی نگاہ حقارت سے دیکھ رہی ہے۔ تمہارا "علم" اسرارِ کائنات کے مقابلہ میں اس سے بھی زیادہ حقیر ہے جس قدر تم معمولی کے علم کے مقابلہ میں ایک چیونٹی کے دماغ کو سمجھتے ہو۔

تمہارا وہ ذہن جس کو تم انسان کی ذہنی ترقی کا انتہائی درجہ سمجھتے ہو تمہاری بربادی کا باعث ہوگا۔ اور تمہارا وہ وجود جس کو تم انسان کے لیے طرۂ افتخار یقین کرتے ہو" اشرف المخلوقات" کے لیے باعث ننگ و عار ثابت ہوگا۔ کاش کہ تم کو معلوم ہوتا کہ تم کس قدر حقیر اور ذلیل ہو! کاش کہ تم سمجھتے کہ قانونِ الٰہی کے تم کتنے بڑے مجرم اور کس درجہ مستحق سرزنش مجرم ہو۔ آہ! تم "باغی" ہو۔ اور نہیں جانتے کہ جرم بغاوت کس سزا اور عتاب کا مستحق ہے۔ آہ! تم خدا کے قائم کیے ہوئے حدود کو توڑنا چاہتے ہو۔ اور نہیں سمجھتے کہ "بغاوت" اسی کا نام ہے۔ تم اسرار کائنات کے بے انتہا خزانوں کا ایک حقیر موتی پاکر مغرور ہو گئے ہو اور سمجھتے ہو کہ" ہم کائنات کے تمام علوم اور قوانین پر حاوی ہو گئے ہیں" حالانکہ تمہارا ظرف ان کی ایک جھلک دیکھ لینے کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا تم "اہرام مصری" کے بانیوں کو بھول گئے ہو تم نے معلم اوّل کی قوم اور ملک کو فراموش کر دیا ہے، یہ وہ قوانین ہیں جنہوں نے تہذیب و شائستگی کے میدان میں تمام دنیا کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ علوم اور حکمت پر تنہا قابض ہو گئے تھے۔ انہوں نے بڑی بڑی تحقیقات کیں۔ عظیم الشان عمارتیں تعمیر کیں۔ اور فلسفہ و حکمت کا بنیادی پتھر نصب کیا۔ لیکن آج وہ قومیں کہاں ہیں؟ دنیا کے کس کونے میں چھپی بیٹھی ہیں؟ "ہیروڈوٹس" کو بلاؤ، وہ دنیا کا ایک چکر لگائے "منطقہ باردہ" سے "منطقہ حارہ" تک کا سفر کرے۔ اور "ہرمان" کے بانیوں کو تلاش کرے۔ ہم کو بتلائے کہ وہ باعظمت وجود کیوں اب دنیا کو اپنی صورت نہیں دکھلاتے؟ "ابوالہول" کی آنکھیں ان کے انتظار میں پتھرا گئی ہیں اور "مدفن انزیروس" ان کے بغیر وحشت کدہ بن رہا ہے۔ ہاں! "ہیروڈوٹس" سے پوچھو کہ "ابوالمتقین" اور "ابوالحکمت" اب دنیا سے کیوں ناراض ہو گئے ہیں؟ "کوہ لبیس" کی چوٹیاں بلند ہو ہو کر ان کو تلاش کر رہی ہیں۔ اور یونان کی شہزادی "ایتھنس" ان کے انتظار میں "مریخ" اور "مشتری" کے منازل سر کر رہی ہے۔ آہ! ہیروڈوٹس کی دنیا ہلاک ہو گئی۔ اب اس کی خبر نئی دنیا کو نہیں مل سکتی۔ "ابوالہول" انتظار کرتے کرتے فنا ہو جائے گا۔ اور "یونان" کی شہزادی آسمانی دیوتاؤں میں مدغم ہو جائے گی مگر ان قوموں کا کچھ سراغ نہیں ملے گا۔ یہ وہاں پہنچ گئی ہیں جہاں سے ان کی نہ کوئی خبر آ سکتی ہے اور نہ ہماری خبر ان کو پہنچ سکتی ہے۔ مگر آہ! تم نہیں سوچتے کہ اس عظمت اور جبروت کی قومیں کیوں عالم کائنات سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دی گئیں۔ یہ علوم و فنون کا مخزن تھیں اور تہذیب و شائستگی کی بانی تھیں۔ پھر انہوں نے کونسا ایسا قصور کیا تھا جس کی پاداش میں ان کا نام صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا؟ تم اپنی تاریخی معلومات سے مدد لو۔ "آرکیالوجی" کے آثار و نتائج کا مطالعہ کرو۔ اور "کالڈیا" کی اینٹوں کے نقوش کو پڑھنے کی کوشش کرو۔ تم کو معلوم ہو جائے گا کہ انہوں نے

نے قدرت کے مقدس قوانین سے سرتابی کی تھی، خدا کے قائم کیے ہوئے حدود کو توڑنا چاہا تھا۔ اور نوامیسِ الٰہی کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ انہوں نے قوانینِ قدرت کی الٰہی حکومت سے بغاوت کی تھی اور فاطر السمٰوات والارض کے اختیارات کو نظرِ حقارت سے دیکھا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرائم کے نتائج جرمس بن کر قوم اور سوسائٹی کے عضو میں سرایت کر گئے اور تنزل و ترقی کا قانون رفتہ رفتہ اپنے اختیارات سے کام لینے لگا۔ آسمان گرد آلود ہو گیا اور غلیظ ابر کی چادر نے نیلے رنگ کے خوش منظر گنبد کو چھپا لیا۔ وہی قومیں جن کی شوکت، ترقی، تہذیب اور شائستگی کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی حیرت انگیز طریقہ سے برباد اور ہلاک ہو گئیں اور آن کی آن میں ان کی تمدنی املاک دوسری قوموں کے قبضے میں نظر آنے لگیں۔ "اہرام" کا سربفلک دیو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان کو تلاش کر رہا ہے۔ "ابوالہول" کی آنکھیں ان کے انتظار میں سفید ہو گئی ہیں۔ اور "زیلیس" کی چوٹیاں ان کی تلاش میں ہزاروں قرنوں سے آفاتِ سماوی کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ مگر یہ قومیں اس طرح نابود اور معدوم ہو گئی ہیں کہ دنیا کے کسی کونے سے ان کی آواز نہیں آتی۔ اور عالمِ کائنات ان کا نشان بتلانے سے عاجز آ گیا ہے۔

تم ان قوموں کے حالات سے عبرت پکڑو۔ ان کی ترقی کو دیکھو اور پھر ان کے تنزل کے صفحات کا مطالعہ کرو۔ تہذیب و شائستگی کے لحاظ سے یہ قومیں اپنی دنیا میں وہی درجہ رکھتی تھیں جو آج "مشرق" کی تاریکی کی بدولت تم کو حاصل ہے۔ مگر فاطر السمٰوات والارض کے اٹل قوانین کی سرتابی نے ان کو چشمِ زدن میں برباد کر دیا اور اس طرح نابود و معدوم ہو گئیں گویا دنیا میں ان کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔ تم "فراعنہ" کے قدیم دار الحکومت کی سیاحت کرتے ہو۔ "اہرام" مصری کی نہایت غور و فکر سے پیمائش کرتے ہو۔ تم نہیں سنتے کہ زیلیس کے تخت گاہ کا چپہ چپہ زبانِ حال سے کیا کہتا ہے؟ تم نہیں سنتے کہ اہرام کی چوٹیاں اپنے نظارہ کرنے والوں سے رو رو کر کیا کہتی ہیں؟ آہ! وہ اپنے رہنے والوں کا جانگداز قصہ سناتا ہے۔ اور یہ اپنے بنانے والوں کی درد انگیز سرگزشت سناتی ہیں۔ وہ اپنے دیکھنے والوں کو زبانِ حال سے نصیحت کرتا ہے کہ:

جن قدموں کے تلے مجھے رہنے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ ان کی عظمت اور شوکت کا ثبوت میری پامال زمین کا چپہ چپہ دے رہا ہے۔ مگر قوانینِ الٰہی سے بغاوت نے ان کی عظمت کو ذلت اور ہلاکت سے مبدل کر دیا ہے اور ان کی ترقی تنزل سے مرعوب ہو گئی۔ آج مصر کے عتیق خانے میں جا کر ان کی پرہیبت صورتوں کا نظارہ کر لو۔ کس قد و قامت کے لوگ تھے

اور کیسی کیسی عظیم عمارتیں ان کے قوی ہاتھوں نے تیار کی تھیں، لیکن آج عالم کائنات کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ان کا کوئی نام لیوا بھی نظر آتا ہے؟ یہ کیوں ہوا؟ صرف اس لیے کہ نفرت اور غرور نے ان کی گردنوں کو قوانینِ الٰہی کی طرف موڑ دیا اور خدا کے قائم کیے ہوئے حدود کو انہوں نے نظرِ حقارت سے دیکھا۔ نظرِ اغماض سے مجھ کو دیکھنے والو! کہیں تم بھی ان کی طرح اپنے ہاتھوں برباد اور ہلاک نہ ہو جانا۔

اسی طرح فراعنہ کا منارۂ عظمت اپنے نظارہ کرنے والوں کو نصیحت کرتا ہے کہ:۔

میرے بنانے والے تم سے زیادہ قوی اور طاقتور تھے۔ مگر قوانینِ الٰہی کے احکام کے آگے انہوں نے نخوت اور تکبر سے سر نہیں جھکایا آہ! ان کی قوت اور طاقت خاک میں مل گئی اور ہمیشہ کے لیے دنیا سے نابود کر دی گئی۔

زمانہ حیران ہے کہ ان عظیم الشان مناروں کے بنانے سے بانیوں کا مقصد کیا تھا؟ "رولن" "ہرمان" کو فراعنہ کا مدفن سمجھتا ہے اور مصریوں کی فضول خرچی اور اسراف کو نہایت حقارت اور ذلت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اصل حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ دیدۂ عبرت سے ان میناروں کو دیکھو۔ یہ اپنے بنانے والوں کا مقصد زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں:۔

ہم اس صحرائے منقش میں اس لیے کھڑے کیے گئے ہیں کہ آنے والی قوموں کو اپنے بنانے والوں کی عبرت انگیز داستان سُنا سُنا کر نصیحت کریں اور حکومتِ الٰہی سے بغاوت کرنے کا مہلک نتیجہ دنیا کے سامنے پیش کر دیں۔ مبارک ہیں وہ جو ہماری آواز پر کان دھرتے ہیں اور چشمِ عبرت سے ہمارے مجسم نصیحت وجود کو دیکھتے ہیں۔

ہمارے رسالے کی گذشتہ فصلوں سے تم کو بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئی ہوں گی۔ عام خیال یہ ہے کہ یورپ کی جدید علمی ترقی مرد اور عورت کو ایک نظر سے دیکھتی ہے۔ مگر فرید و جادی کی زبانی تم کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ آج یورپ کے نام سے جس قدر غلط باتیں مشرق میں مشہور ہیں۔ ان میں اس دعویٰ سے بڑھ کر اور کوئی خیال غلط، بے سر و پا اور کذبِ محض نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مردوں کے تشدد اور ظلم نے غریب عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں مقید کر دیا ہے۔ لیکن گذشتہ صفحات نے تم پر ثابت کر دیا ہو گا کہ مردوں نے نہیں بلکہ خود عورت نے عورتوں کی زندگی کو منزلی دائرے میں محدود کر دیا ہے ہمارے رسالے کی گذشتہ

فضول کی بدولت یورپ کے جن مشاہیر علماء کی خدمت میں تم کو باریابی کا شرف حاصل ہوا ہے ان میں سے
ہر ایک عالم علم و کمال کے دربار کا صدر نشین ہے۔ تم کو اس وقت تک وہ باعظمت مجلس یاد ہوگی جس میں ایک
طرف ڈرل سیمان دوسری طرف ڈوٹر ویشہ (DUTOCCHET) سامنے کرسی صدارت پر "آگسٹ کونٹ"
جیسے روسا فلاسفہ اور مجتہدین علوم جدیدہ رونق افروز تھے۔ تم کو وہ مؤثر گھڑی اب تک نہ بھولی ہوگی جب
"ڈرل سیمان" کی پُر حکمت تقریر نے "قاسم امین بک" کے تمام دعووں کی قلعی کھول دی تھی۔ وہ آسمانِ علم کا آفتاب
ہے۔ وہ فلسفہ و حکمت کا نفس زریں معلم ہے۔ تم کو وہ منظر بھی یاد ہوگا۔ جب صدر مجلس آگسٹ کونٹ کے
یادگار لیکچر نے "فزیالوجی و رسائل مادی" کی مسلم تحقیقات کو پیش کر کے عورتوں کے فرضی وکیلوں کے تمام
دعووں پر پانی پھیر دیا تھا۔ ممکن نہیں کہ تم اس عجیب منظر کو بھول جاؤ۔ ہاں! وہ یورپ کا استاذ الاساتذہ ہے وہ
مجدد حق کا مجدد اعظم ہے۔ تم کو قاسم امین بک کی وہ صورت بھی یاد ہوگی جس پر صدر مجلس کی تقریر نے
ناامیدی اور خجالت کے اثرات پیدا کر دیے تھے۔ تم کو فرید وجدی کا وہ بشاش چہرہ بھی یاد ہوگا جو زیر لب خندہ
سے اپنے ناکام حریف کی موجودہ حالت کی بے ادبانہ چڑایا جاتا تھا۔ ہم کو امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ "ڈرل
سیمان" جیسے محقق کی تقریر نے تمہاری اچھی طرح تشفی کر دی ہوگی۔ علامہ "ڈوٹروشیہ" کے لیکچر نے تمہارے دل
سے تمام شکوک رفع کر دیے ہوں گے اور عورتوں کے فرضی وکیل جو بے سر و پا دلائل پیش کیا کرتے ہیں ان کی
وقعت اور اہمیت سے تمہارا دانشمند دماغ خالی ہو گیا ہوگا۔ کیا قاسم امین بک کے حامی "مسٹر جان جارڈ" اور
"فرتس نو" ایسے مرشد کے لیے بھی اس آفتابِ فضل و کمال کے سامنے ٹھہر سکتے ہیں؟ کیا ان کی حمایت قاسم
امین بک اور اس کے ہم خیال لوگوں کے لیے مفید ہو سکتی ہے؟ کون ہے جو اثبات میں جواب دے سکتا
ہے؟ اور کون ہے جو اثبات میں جواب دے کر اپنی ناواقفیت اور لاعلمی کو ثابت کر سکتا ہے؟ جبکہ یورپ
بہ متفقہ لفظوں میں اس کے فضل و کمال کا معترف ہے اور کشورستان علم کا تاجدار تسلیم کرتا ہے تم جانتے
ہو کہ پیرودن اور سمول سامس کس پایہ کے مصنف ہیں۔ آخر الذکر کے مبارک نام سے تم ضرور واقف ہوگے
کیونکہ تم جدید یافتہ ہو اور کوئی تعلیم یافتہ ایسا نہیں ہے جس کی الماری "ڈیوٹی" اور "سلف ہلپ" سے خالی
ہو۔ مگر اول الذکر کے فضل و کمال سے اگر واقف ہونا چاہتے ہو تو انسائیکلوپیڈیا کی ورق گردانی کرو۔ وہ شخص ہے جو "سوشلزم" کا مجدد و سرخیل
تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک مشہور تصنیف "ایلیمنٹس آف پولیٹیکل اکانمی" اور نظام تمدن کی پالیسیوں کا سرچشمہ ہے۔ ہاں! ہم کو
پورا یقین ہے کہ یورپ کی اس منتخب اور اعظم ترین جماعت کی ملاقات نے تم کو "فرید وجدی" کا ہم خیال

اور ہم زبان بنا دیا ہوگا۔ فرید وجدی کی رائے سے تم کیوں نہ متفق ہو۔ جبکہ تم خود گذشتہ صحبتوں میں دیکھ چکے ہو۔ کہ مشاہیر یورپ، مؤسسین علوم اور مصنفین انسائیکلو پیڈیہ ہمارے فاضل دوست کو تحسین اور اتفاق کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے سب کے آخر میں تقریر کی۔ مختصر اور پرمغز کی۔ اچھی طرح یاد کرو۔ بزرگ صدرِ مجلس اور باکمال ارکانِ مجلس اس کے ہر لفظ پر تحسین اور توصیف کے نعرے بلند کرتے تھے۔ اور مرحبا کی گونجتی ہوئی آواز دور دور تک لوگوں کو بتلا دیتی تھی۔ کہ مقرر کی رائے سے ارکانِ مجلس کس درجہ متفق اور ہم آہنگ ہیں ؛

گذشتہ صحبتوں کی تقریروں سے تم کو یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ مشرق عورتوں کے متعلق جو رائے رکھتا ہے۔ اس کو ظالمانہ رائے کہنا ظلم اور صریح ظلم ہے مشرق اگر عورتوں کو ناقصات العقل والدین کا خطاب دیتا ہے تو کیا ظلم کرتا ہے؛ جبکہ "علمائے یورپ" میں ——— ایک عالم عورتوں کی عقل کو طفلِ شیر خوار کی عقل "دوسرا" انسان کے ابتدائی اور ناقص دور کی یادگار، اور "تیسرا" ضعیف ترین بتلاتا ہے۔ تم اچھی طرح سمجھ گئے ہوگے۔ کہ عورتوں کی عقل اور جسمانی قوت کے متعلق علم کے دیوتا کا کیا فیصلہ ہے تم اس نتیجہ پر بھی پہنچ گئے ہوگے کہ عورتوں کے فرضی وکیل جو راگ الاپ رہے ہیں۔ علم کا دیوتا حکم صادر کرتا ہے۔ کہ وہ نہ صرف غلط ہے بلکہ دنیا کے لیے۔ دنیا کے تمدن کے لیے۔ معاشرت کے لیے اور سوسائٹی کے لیے مضر اور سینکڑوں تمدنی خرابیوں کو پیدا کرنے والی ہے ؛

لیکن ابھی ایک اور اہم بحث باقی ہے۔ علم و فضل کے دربار میں باریاب ہوئے۔ مگر رعب و داب نے اس امر کا بہت کم موقع دیا کہ اپنے تمام دِلی شکوک رفع کر لیں گذشتہ صحبت میں یورپ کے اعاظم اور کبار علماء کی تقریروں نے اس امر پہ جا بجا زور دیا ہے۔ کہ جس آزادی کے "قاسم امین بک" اور اس کے ہمخیال طالب ہیں۔ وہ قوانین قدرت کے بالکل خلاف ہے" انسائیکلو پیڈیا کے مصنفین نے اپنی تقریروں میں اس خیال کو بھی غلط ثابت کر دیا ہے کہ "فزیالوجی" اور "سائی کولوجی" کی تحقیقات مرد اور عورت کو دماغی قویٰ کے لحاظ سے ایک درجہ میں رکھتی ہیں" "آگسٹ کونٹ" اور "پرودٹن" نے اس پر بھی زور دیا ہے کہ چونکہ عورتوں کی یہ منفرد آزادی قوانین الٰہی اور نوامیس طبعی کو توڑنے والی ہے اس لیے جب کبھی اس پر عمل کیا جائے گا۔ تمدن اور معاشرت کی بنیادیں متحرک ہو کر بتلا دیں گی کہ منفرد آزادی کا زلزلہ سوسائٹی کی عظیم الشان عمارت کو دم کی دم میں بے بادکر دینے والا ہے۔ ان تمام باتوں کے سننے کے بعد طبیعت میں خود بخود چند شبہات پیدا

ہو جاتے ہیں۔ علم الاعضا اور علم النفس وا قوی کی تمام تحقیقات بے سروپا معلوم ہوتی ہے۔ "نزول بیان" "آگسٹ کونٹ" اور "پرودہان" جیسے آسمانِ افضل وکمال کے آفتاب تاریکی کے دیوتا نظر آتے ہیں اور "فرید وجدی" کی ہنگامہ خیز تقریر، دنداں شکن جواب اور پر زور دلائل کی اہمیت ان کی آن میں حقارت ور ذلت سے مبدل ہو جاتی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ:

یورپ جو ان تمام تحقیقات کا مبدا اور ان تمام محققین کا وطن ہے۔ اس کا طرزِ عمل ان تمام تحقیقات اور آراء کا مخالف نظر آتا ہے۔ جس قوم کے سر برآوردہ علماء یہ خیال ظاہر کر رہے ہیں۔ خود وہ قوم ان پر عامل نہیں ہے، ہم اقوال کی پیروی کریں یا طرزِ عمل کی؟

ایک مرتب اور مسلسل سلسلہ پیش نظر آجاتا ہے۔ شبہات قوی ہو جاتے ہیں۔ اور یہ سوالات دماغ میں پیدا ہو کر فرید وجدی کی مخالفت پر زور دینے لگتے ہیں۔

کیا یہ سچ ہے کہ علمائے یورپ عورتوں کی مفرد آزادی، مساواتِ حقوق اور تمدنی مشاغل میں شرکت کے مخالف ہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو پھر یورپ خود ان کی اس رائے پر کیوں نہیں عامل ہوتا؟ ہم کو یقین دلایا جاتا ہے کہ عورتوں کا عقلی اور جسمانی ضعف فطری ہے اور قانونِ قدرت یہی ہے کہ عورتوں کی دنیا مردوں کی دنیا سے بالکل الگ رہے۔ ہم کو علمائے یورپ کے اقوال سنا کر سمجھایا جاتا ہے کہ عورتوں کی مفرد آزادی اور مساواتِ حقوق کی کوشش تمدن اور معاشرت کو برباد کرنے کی کوشش ہے۔ جب کوئی سرکش قوم قوانینِ قدرت سے سرتابی کرتی ہے، تو مختلف قسم کے تمدنی اور معاشرتی آلام و مصائب کا شکار ہو جاتی ہے۔ پس اگر یہ سچ ہے تو کیا یورپ عورتوں کو مفرد آزادی دے کر تمدن اور معاشرت کی بنیادوں کو متزلزل کر رہا ہے؟ کیا قوانینِ قدرت کی بغاوت نے یورپ کی سوسائٹی میں وہ مہلک مرض پیدا کر دیا ہے جس کی بدولت اقوامِ سابقہ تباہ و برباد ہو چکی ہیں؟ کیا یورپ کی زندگی خوشحالی اور آرام کی زندگی نہیں ہے؟ ہم کو بتلایا جاتا ہے کہ عورتوں کا قدرتی فرض فرائض منزلی کی بجا آوری ہے مگر یورپ میں عورتیں دنیا کی تمدنی کشمکش میں برابر کی شریک نظر آ رہی ہیں۔ تو کیا اس شرکت کے ہلاکت نتائج یورپ میں پیدا ہو چکے ہیں؟ ہم کیونکر ان سوالوں کا جواب اثبات میں دے سکتے ہیں۔ جبکہ یورپ آج تمدن کا سرچشمہ ہے جبکہ یورپ کی سوسائٹی موجودہ دنیا کی بہترین سوسائٹی

ہے۔ جبکہ یورپ آج تمام دنیا کا تمدنی معلم ہے اور جبکہ یورپ ہی دنیا بھر میں ایک ایسا مقام تسلیم کیا جاتا ہے، جہاں کے لوگ معاشرت کا حقیقی لطف حاصل کرتے ہیں ۔۔

لیکن درحقیقت یہ ایک دھوکا ہے جس میں بدقسمتی سے آج مشرق کا بڑا حصہ گرفتار ہے۔ دور کی چیز بہت دلفریب معلوم ہوتی ہے اس لیے یورپ کو جس عقیدت اور ارادت کی نظر سے دیکھتے ہو اس کا اقتضا ہی ہے کہ تمہارے دماغوں میں یہ شبہات پیدا ہوں کہ وہاں کی زندگی نہایت خوشنما اور وہاں کی سوسائٹی بے حد دلکش ہوتی ہے یورپ کی علمی ترقی اور تمدنی وسعت کی الیکٹرک لائٹ نے تمہاری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے، اس لیے حسن ظن تم کو اجازت نہیں دیتا کہ کسی مخالف رائے کو آسانی سے تسلیم کر لو۔ مگر جب یورپ کے موجودہ تمدن اور سوسائٹی کی ایک مکمل تصویر تمہارے سامنے پیش کی جائے گی تو سارے عقدے حل ہو جائیں گے اور شبہات کالعدم ہبآ منثورا، ہو جائے گا۔ تم نہایت حیرت کے ساتھ دیکھو گے کہ تمہارا حسن ظن کس قدر دھوکہ دینے والا اور اصل حقیقت سے بے خبر رکھنے والا تھا۔ تم سخت متعجب ہو گے کہ یورپ جو علم و فن کا مرجع، معلم اور ماوا و ملجا ہے کس طرح قوانین قدرت کی بغاوت کی پاداش میں معاشرت کے سکون اور اطمینان کی نعمت سے محروم ہو گیا ہے۔ وہی یورپ جو مشرق کو نیم وحشی سمجھ کر اس سادگی اور جہالت پر ہنستا تھا، آج مفروضہ آزادی کی بدولت اپنی سوسائٹی کو وحشیانہ ہیجل اور تکلیف دہ خلفشار کا سرچشمہ بنا رہا ہے اور اس کی سوسائٹی اب اس قدر آرام اور راحت بھی نہیں دے سکتی جس قدر امریکہ کا ایک وحشی یا افریقہ کا ایک غیر متمدن درختوں کے جھنڈ سے بنے ہوئے گھروں میں بیٹھ کر نہایت اطمینان اور سکون سے حاصل کرتا ہے۔

کیا تم یورپ کی سوسائٹی کی ایک جھلک دیکھنا چاہتے ہو؟ کیا تم اس منظر کے مشتاق ہو جو ان شبہات کی کرب اور بے چینی سے تم کو نجات دلا دے؟ ہاں تمہاری متجسس نظریں اس منظر کی تلاش میں ہیں تم کو زیادہ انتظار اور تجسس کی تکلیف نہیں دینا چاہتے۔ ورق الٹو۔ آئندہ فصل یہ منظر پیش کر دے گی ۔۔

دور رہ جاتا ہے۔

ہماری کتاب کی یہ فصل مغربی معاشرت کے طلسم کی کنجی ہے اور تم اس کی مدد سے اس قفلِ ابجد کو کھول سکتے ہو جس کو مغربی حسنِ ظن نے مغربی معاشرت کے صندوق پر لگا دیا۔

حسنِ ظن، معلومات کی کمی، نظر کی کوتاہی اور جدت پرستی نے مغربی سوسائٹی کی صحیح صورت پر تو پردے ڈال دیئے ہیں۔ اور عالمگیر غلط فہمی ہے جس میں بدقسمت مشرق گرفتار ہے۔ ہماری کتاب کی یہ فصل ان مصنوعی پردوں کو یک لخت اٹھانے میں اگر ناکامیاب بھی ہے۔ تو بھی اصلی صورت کا ایک صحیح نظارہ پیش کر دے گی کہ لو کشفت الغطاء لما ازددت یقینا۔

تمہاری نگاہیں بحرِ احمر کو طے کر کے مغربی سرزمین میں قدم رکھتی ہیں اور روشنی کی ایک جھلک دیکھ رہی ہیں۔ روشنی بہت تیز ہے اور اس میں ایک ایسی سڑک پائی جاتی ہے جس نے تمہاری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے تمہارا حسنِ ظن ہے کہ یہ روشنی ایک مینارۂ روشنی کی شعاعیں ہیں جو مشرقی نگاہوں میں منعکس ہو رہی ہیں۔ مگر یہ فصل خود تم کو بحرِ احمر کے اس پار دنیا کی سیر کرا دے گی۔ اور تم نہایت حیرت سے دیکھو گے۔ کہ جس روشنی کو تم مینارۂ روشنی کی جھلک سمجھ رہے تھے وہ فاسفورس کا ایک معمولی کرشمہ تھا۔

یورپ سے مشرق کے نئے تعلقات نا گوارانہ اور عاجزانہ ہیں۔ استاد کی مافوق الفطرت عظمت دلوں میں گھر کر رہی ہے۔ اور عقیدت کا سیلاب حقائق کے ذخیرہ کو بہائے جانا چاہتا ہے غلط فہمی کا طوفان زوروں پر ہے۔ اور وہ وقت قریب ہے جب واقعات فرشتہ حسن ظن اور عقیدت کے دیو سے سخت ہزیمت اٹھائے گا۔ اس لیے ہماری کتاب کی یہ فصل تمہاری رہنمائی کرنا چاہتی ہے اور تم کو حقائق کی منزل تک پہنچ کر ان آفات سے محفوظ کر دینا چاہتی ہے۔ جن کو تمہاری نظروں کی کوتاہی اور معلومات کی کمی نے تم پہ مسلط کر دیا ہے۔

ہمارے اس بیان کی بہت سی محسوس دلیلیں مل سکتی ہیں۔ کہ ہر ملک اور خطے میں انسانی طبیعت اصل حقیقت کو چھپانے کے لیے اور اپنی بداعمالیوں کو فریب اور نمائش کے پردوں میں پوشیدہ کرنے کے لیے سخت جدوجہد کر رہی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی نوامیسِ الٰہی اور قوانینِ قدرت کی عظیم الشان قوت بھی ذلیل اور شریر انسان کی اس بناوٹ اور ریاکاری کے پردے کو چاک کیے بغیر نہیں رہتی۔ انسان وقتی اور مصنوعی کامیابیوں کے غرور میں تمردانہ اور گستاخانہ رویہ اختیار کر لیتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ میں اپنے

اپنی بناوٹی کوششوں میں کامیاب ہو جاؤں گا مگر احکام فطرت اس کی چالبازیوں کی قلعی کھول دیتے ہیں۔ اور تنبیہ اور سرزنش کی زبان سے بتلا دیتے ہیں کہ انسان کی شرارت قدرت کے مقابلے میں ایک منٹ کے لیے بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ تم ہمارے اس بیان کو شک اور حیرت کی ملی ہوئی نگاہوں سے کیوں دیکھتے ہو؟ ہم صرف دعوے ہی نہیں کرتے اور اپنا خیال اور رائے ہی بیان نہیں کرتے بلکہ جو کچھ کہتے ہیں وہ علم ہوتا ہے واقعات کا اور خلاصہ ہوتا ہے روزمرہ کے مسلسل اور متواتر مشاہدات کا ہمارے بیان اور اقلیدس کی شکلیں، دو متحد چیزیں ہیں جن کو دنیا مختلف ناموں سے یاد کرتی ہے ہمارا بیان اور ریاضی کی بدیہیات عبارت میں ایک ہی مفہوم ہے جن کو زمانہ غلطی سے دو چیزیں قرار دیتا ہے۔ ہمارے بیان کی صحت کا اقرار کر بالکل ایسا ہی جیسے زید کے اس قول کو تمردانہ گستاخی کے ساتھ عمر قبول نہ کرے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔

تم دنیا اور دنیا والوں پر ایک غائر نظر ڈالو۔ تم کو معلوم ہو جائے گا کہ اس قسم کے حوادث ان مقامات میں بکثرت وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ جہاں اس قسم کی فریبانہ کارروائیاں افراط سے کی جاتی ہیں۔ اور جہاں فضول ظاہر داری کا حد سے بڑھ کر عمل درآمد ہے۔ دیکھو یہ متمدن قومیں کیسے کیسے عقل کو چکر میں ڈال دینے والی تدبیروں اور مبہوت بنا دینے والے دعووں سے امراض کو روکنے کی فکر کرتی ہیں۔ ادویات ایجاد کرتی ہیں اور حفظانِ صحت کے انتظاموں پر کروڑوں روپے سالانہ خرچ کر دیتی ہیں۔ مگر باایں ہمہ جدوجہد جب غور سے دیکھا جائے تو جس قدر مہلک اور سخت امراض شہروں اور خاص کر زیادہ آباد متمدن مقاموں میں پھیلے ہوئے ہیں ان کے بالمقابل وحشی اور صحرانشین سادہ مزاج قوموں میں کہیں ان امراض کا نام و نشان بھی نہیں دیکھا جاتا۔ حالانکہ ان بے چاروں کے پاس نہ حفظانِ صحت کے محکمے ہیں اور نہ بلند خیال اور تجربہ کار ڈاکٹر نہ بیماریوں سے بچنے کے ایسے وسائل جن کو عقلمند کی عقل تسلیم کر سکے۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے؟ یہی کہ وہ ابتدائی بسیط حالت اور فطری سادہ زندگی بسر کرنے میں ان متمدن و انسانیت کا بڑھ چڑھ کر دعوے کرنے والی قوموں سے بہت کچھ بڑھے ہوئے ہیں۔ وہ براہِ راست قانونِ فطرت کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں مگر متمدن قومیں اپنے علم و عقل سے بہرہ ور ہونے کے گھمنڈ میں طرزِ زندگی کے میدان کو اپنے ہوائے نفسانی ہی کے گھوڑوں پر سوار ہو کے طے کرتی اور ظاہری وسائل استعمال کر کے احکام خلقت کی خلاف ورزی کے نقصانات سے بچنے کی کوشش میں مصروف رہتی ہیں مگر ان کی یہ روش فی الحقیقت انہیں ان قوانینِ قدرت کی زنجیروں میں سادہ زندگی کی نسبت کہیں زیادہ جکڑ دیتی ہے اور بجائے اس کے کہ وہ اصولِ فطرت کی

زد سے بچ جائیں اپنی نمائشی کارروائی کے ذریعہ سے دوسری دست پرانی سنت باربار بنتے ہیں۔ اس بارہ میں ان کی مثال سمجھانے کے واسطے صرف ان کی عورتوں کی حالت بطور نمونہ دکھانا کافی ہے۔ یورپ کے بعض خیال پرست اور وہمی انسان اس بات کے مدعی ہیں کہ ان کی عورتوں کو آزادی کا بہت بڑا حصہ نصیب ہے اور وہ بہ نسبت وحشی اقوام کی عورتوں کے اب اپنی فطری قوتوں سے زیادہ فائدہ اٹھا رہی ہیں یہ مدعیانِ باطل اپنے قول کی تائید میں بہت سے لفظی اور زبانی ثبوت بھی پیش کرتے ہیں۔ مگر دوسری طرف سے قدرت بھی ان کو جھوٹا ثابت کرتی ہے۔ چنانچہ کبھی اس عالم کے مشہور اور سربرآوردہ لوگوں کی زبانوں سے ان شخصوں کا دعوےٰ غلط کر دیتی ہے اور گاہے اپنے محسوس افعال کا اثر دکھا رہی ہے کہ غافل اور وہم پرست انسان مجھ سے اڑ کر کہاں جا سکتا ہے آیئے اور دیکھئے کہ آج سیاہ رنگ وحشی اور جنگلی قوموں کے مرد اور عورت میں اتنا فرق نظر نہیں آتا جس قدر مہذّب اور آزادی کے دلدادہ ممالک کی تعلیم یافتہ قوموں کے مرد اور عورت میں اختلاف پایا جاتا ہے پھر یہ کیا بات ہے؟ یہ ایک عملی علامت ہے جو ثابت کر رہی ہے۔ کہ تمدن دنیا کی یہ نازک جنس (عورت) استمرار کے ساتھ اپنے قدرتی مرتبہ سے نیچے گرتی چلی جاتی ہے اور اس کا یہی مبسوط زبانِ حال سے چلا کر کہہ رہا ہے۔ کہ تم عورتوں کی گرفتاری اور ماتحتی کے ظاہری پہلو کو چاہے جس قدر چمکا کر دکھاؤ یا اسے آزادی و خود مختاری بتاؤ۔ لیکن پھر بھی بہ نسبت اور وحشی قوموں کے مہذب قوموں کی عورتیں نہایت سخت قید اور بند میں پھنسی ہوئی ہیں۔

جناب مؤلف[1] کا قول ہے ”ان عورتوں کی تعداد جو دستاویزوں عرضی دعووں اور ایسے ہی دوسرے کاغذوں کی تحریر کا کام کرتی ہیں یا جو گرجا کی خدمت ادا کرتی ہیں یا ریاضی داں اخباروں کی مہتمم اور ایڈیٹر ہیں چھاپہ خانوں میں کام کرنے والی اور پوسٹ آفس اور تار کے محکموں میں کام کر رہی ہیں۔ شمار نہیں کی جا سکتی اور عورتوں کو زیادہ تر سررشتہ تعلیم کے عہدے ملتے ہیں۔ چنانچہ اس صیغہ میں تقریباً مدارس ابتدائی کی معلمہ عورتیں فی صدی پچانوے پائی جاتی ہیں“۔ فاضل مؤلف نے اپنے کلام کے آخر میں یہ جملہ (یا بعض مقامات پر ایسے ہی اور جملے بھی) محض آزادی عورات کی خوبی دکھانے کی نیت سے بڑھائے ہیں۔ نہ کہ اقتصادی۔ علامہ نزول سیمان۔ ”ریویو آف ریویوز“ کی اٹھارھویں جلد میں لکھتا ہے ”آج کل عورتیں پارچہ بافی کی مشینوں اور چھاپہ خانوں میں کام کرنے لگی ہیں۔

---

[1] مؤلف تحریر المرأۃ

حکومت نے ان سے اپنے کارخانوں میں کام لینا شروع کر دیا ہے اور گو وہ اس ذریعہ سے پیسے ٹکے کما لیتی ہیں۔ لیکن اس کے مقابلہ میں انہوں نے اپنے گھروں کی بنیاد کھود ڈالی اور ان کو برباد کر دیا ہے، ہاں اس میں شک نہیں کہ مرد اپنی عورت کی کمائی سے مستفید ہو رہا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ اس کی کاروباری زندگی سے تنگ بھی آ گیا ہے کیونکہ اب عورت اس کے کام چھینتی جاتی ہے اور مرد کو بیکار بنا رہی ہے۔ پھر آگے چل کر لکھتا ہے اور یہاں یورپ میں کچھ عورتیں مذکورہ عورتوں سے بھی زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ جو دفتروں کی کلرک، دکانوں کی منتظم اور سودا بیچنے والیاں مدارس میں تعلیم کی خدمت انجام دینے پر مامور اور ڈاکخانہ تار گھر، فرانسیسی بنک وغیرہ بڑی بڑی بنکوں میں ملازم ہیں۔ مگر ان سب باتوں کے ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ ان خدمات نے ان عورتوں کو منزلی زندگی سے بہت دور کر دیا ہے۔ اور وہ گھرانے کی رونق و متانت کھو چکی ہیں۔ یہ ایک ایسے شخص کا قول ہے جو خود صاحب خانہ ہے۔ اور اس میں کلام نہیں ہو سکتا کہ جس قدر گھر والے کو اپنے گھر کے حالات کی خبر ہوتی ہے۔ دوسروں کو اتنا علم کہاں ہوگا۔ اس لیے ہمیں مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے اقوال کا کچھ وزن خیال نہ کریں اور اس کے خلاف باتوں پر توجہ دیں۔

جناب مؤلف فرماتے ہیں :-

امریکن عورت کی ترقی اور اس کی عظمت شان دکھانے کے لیے صرف اتنا بیان کر دینا کافی ہوگا کہ ۱۸۹۰ء کی مردم شماری سے ظاہر ہوا تھا کہ امریکہ میں محض ان عورتوں کی تعداد جو علمی و زبان دانی خدمتیں انجام دیتی ہیں۔ فی صدی ۵۷، صیغہ تجارت میں کام کرنے والی عورتوں کی تعداد فی صدی ۴۳ اور دستکاری کے صیغہ میں فی صدی ۶۲ ہے۔

مگر اس کے ساتھ مؤلف ممدوح نے اس کا کوئی بھی ذکر نہیں فرمایا کہ اس ترقی نے وہاں کی معاشرت پر کیا زہریلا اثر ڈالا ہے اور سوسائٹی کے وجود میں کیسے رخنے پیدا کر دیئے ہیں جن کو وہاں کی صحیح مردم شماری اور محکمہ عدد و شمار کی رپورٹوں سے واقف آدمی بخوبی جانتا ہے کہ اس متمدن ملک میں سوسائٹی کا کیا حال ہے چنانچہ ہم اسی ہاتھوں ناظرین کی توجہ اس مختصر پر مائل کرنا چاہتے ہیں جو میڈم ڈو فریبو نے امریکن عورتوں کی علمی و صنعتی ترقی پر اپنے رسالہ انیس الجلیس، مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۸۹۵ء میں درج کیا ہے میڈم مذکورہ نے امریکن عورتوں کی کاروباری اور علمی ترقی کے شمار و اعداد دکھانے کے بعد لکھا ہے :-

مگر ان باتوں کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس قدر عورت علوم و ہنر میں زیادہ وسعت حاصل کرتی ہے۔ اسی قدر مرد اس کو طلاق دیتا جاتا ہے۔ چنانچہ طلاق کی زیادہ صورتیں ولایاتِ متحدہ امریکہ میں پائی جاتی ہیں وہاں یہ معاملہ اس قدر حیرت انگیز حد تک ترقی کر گیا ہے جس کی مثال ان (مصری وغیرہ) اسلامی ممالک یا اور مشرقی ملکوں میں ہرگز نہیں پائی جاتی۔

میڈم ممدوحہ نے طلاق کے جس خطرہ کا ذکر کیا ہے۔ سردست ہم اسے مناسب مقام پر ذکر کرنے کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ مگر یہاں اس قدر ضرور کہیں گے کہ عورت کا علوم و آداب میں توغل کرنا اسے مرد کی نگاہوں میں قابلِ نفرت بنا رہا ہے۔ اور جو چیز اسے سب سے زیادہ بدنما اور حقیر بناتی ہے وہ اس کا خارجی عمل میں مقابلہ پر آتا ہے۔

سنہ ۱۸۷۰ء میں امریکن عورتوں کی ایک شاندار کانفرنس زیر صدارت "میڈم مارٹین" قائم ہوئی۔ جس نے اپنے پولیٹکل حقوق کا مطالبہ کیا اور بہت سے ایسے پولیٹکل مردوں کو بھی زیر کر لیا جو قبل از تجربہ عورتوں کے سیاسی معاملات میں داخل ہونے کو مضرت رساں خیال کرتے تھے۔ اس کانفرنس کی ممبر عورتیں عام مجمعوں میں لیکچر دینے، اخباروں میں مضامین لکھنے اور پارٹیوں کے رئیسوں کو پُرزور دلائل سے قائل کرنے میں مصروف ہوئیں۔ یہاں تک کہ آخر کار انہوں نے مجلسِ وزراء سے اس بات کا اقرار کرا لیا کہ وہ انہیں پولیٹکل حقوق عطا کریگی۔ پھر سنہ ۱۸۷۲ء کے آتے ہی میڈم مارٹین نے اپنے آپ کو جمہوریہ امریکہ کی پریسیڈنٹی کے لیے امیدوار بنا لیا۔ اور کثرت رائے سے وہ پریزیڈنٹی منتخب کر لی گئی۔ اس کا کرسی صدارت پر بیٹھنا بجز تھا کہ اس کی سائفر دانیوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ اور وہ سب اس سے کنارہ کشی کر گئیں۔ حکومت نے یہ صورت دیکھی تو فوراً ہی اس قانون کو ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا۔ کیونکہ اسے معلوم ہو گیا کہ عورتوں میں باہم مل کر کام کرنے کی صلاحیت ہرگز نہیں۔ ولایت متحدہ امریکہ کی تاریخ کا یہ ایک مشہور واقعہ ہے اور "ریویو آف ریویوز" کی اٹھارہویں جلد میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔

علامہ پرودن جب عورتوں کو ایسی ناواجب آزادی دینے والوں کی بک بک سے تنگ آگیا تو اس نے لکھا:-

"اور علاوہ اس کے کہ میں اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا جس کا نام آج کل لوگوں نے عورت کو آزادی دکھلا رکھ چھوڑا ہے میری خواہش بھی ہے کہ اگر ضروری اور حالت کا

کو دیکھ کر عقل حیران ہو جاتی ہے۔ تو ان کے زیرِ دست پیشے جو چیز تمہارے پیش نظر ہوگی وہ اس نازک
و لطیف جنس (عورت) کی ایک بڑی جماعت ہوگی جو سخت سے سخت جسمانی پیشوں اور جفاکشی کے کاموں
میں مصروف نظر آئے گی۔ کچھ عورتیں پھرتی ہوئے انجن کے چولہوں کے سامنے ان میں کوئلہ جھونک رہی
ہوں گی جن کے دلفریب چہرے آگ کی گرمی اور کوئلہ اور دھوئیں کی رنگت تم جانتے ہو سیاہ ہو چکے ہوں
گے اور ایسی ناگوار و تلخ زندگی کی آفتوں نے ان کی پیشانیوں پر یہ جملہ لکھ دیا گیا ہوگا جس کا مفہوم تمہارے صفحہ
خیال سے ابدالآباد تک بھی محو نہ ہوگا۔ کہ "مرد" "عورت" کو جس طرح گرفتارِ بلا کر سکتا ہے یہ اسکی انتہائی
حد ہے۔ پھر اگر تم ان آفتوں کی ماری عورتوں سے یہ بات دریافت کرنے کی تکلیف گوارا کروگے کہ آخر دن
بھر اس دنیاوی جہنم میں کام کرنے سے ان کو اجرت کیا ملتی ہے تو سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں متفق اللفظ
ہو کر یہی کہیں گی کہ روزانہ اجرت فی نفر بیس سنٹیم (۲۰ ر) سے زائد نہیں جو اتنی جفاکشی اور ایڑی چوٹی کا پسینہ
ایک کر دینے کے بعد انہیں نصیب ہوتی ہے۔ پھر اتنی اجرت ان متمدن ممالک میں ایک وقت پیٹ بھر
کر کھانے کے واسطے بھی پوری نہیں پڑتی۔ اور ان مزدور عورتوں کی حالت دیکھنے کے بعد اگر کہیں یہ
دیکھنا مقصود ہو کہ وہاں زنانہ ڈاکٹر اور انجینئر عورتیں کس قدر ہیں تو ان کی تعداد فی صدی پانچ سے بھی کم نظر
آئے گی۔ اور یہ تعداد ان ممالک میں ہوگی جو مدنیت اور علم کے اعتبار سے آج ممالک دنیا میں سرتاج مانے
جاتے ہیں۔

علم الانسان کا استاد "جیومس فریزر" "ریویو آف ریویوز" کی پہلی جلد میں جو ۱۸۹۵ء میں شائع ہوئی
تھی، لکھتا ہے:۔

> جس مدنیت کی شکل میں ہم اس وقت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس کی انتہائی پیچیدگیوں
> کے جلد حل ہونے کا خوف دلانے والی علامتیں یوں بہت زیادہ نظر آتی ہیں کہ کوئی دن ایسا
> نہیں گزرتا جس میں کوئی نہ کوئی بحث اور تجسس کرنے والا شخص اٹھ کر چند نئی نئی خطرناک
> باتوں سے واقفیت نہ حاصل کرتا ہو۔ اس لیے ہم کو بھی ایک طبیب کا فرض ادا کرتے
> اور اسی تشخیص کی مساعدت کرنے کی ضرورت ہے جو ہمارے اس زمانے کے اطبا نے اس
> نئے سوشل (معاشی) مرض کے لیے تجویز کی ہے۔ کیونکہ رہبانیت کی پرانی شکل اگرچہ کسی
> دین و ملت کی سند پر قائم نہیں ہوتی ہے تاہم ہمیں اس بات کی دھمکی ضرور دے رہی ہے

کہ عنقریب وہ اس درجہ تک پہنچ جائے گی جس درجہ تک قرونِ وسطیٰ کے زمانے میں دینی
رہبانیت پہنچ گئی تھی۔ یہ بات تمام ملکوں کے مردوں اور عورتوں کے تجربہ میں آگئی ہے کہ
شادی بیاہ کے بارے میں جو دشواریاں اور رکاوٹیں حائل ہو رہی ہیں۔ ان کا شمار روز بروز
بڑھ رہا ہے اور بہت سے معاشی اقتصادی اسباب بھی اس کے راستہ میں رکاوٹیں بن
کر کھڑے ہوتے ہیں۔ جن کی وجہ سے اکثر لوگ آپ میں انہیں دور کرنے یا مغلوب بنانے
کی قوت نہ پا کر مجبوراً مجرد رہنے پر صبر کر لیتے ہیں۔ اس لیے ہمیں یہ کہنے کی گنجائش ملتی ہے
کہ عورت و مرد دونوں جنسوں کی ایک عظیم الشان تعداد کا بغیر شادی بیاہ کے زندگی بسر کرنے
سے موجودہ طرزِ معاشرت کی حالت پر سخت ہولناک اثر ڈالنا لازم آتا ہے یعنی زندگی
کی کاروباری شرطوں میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ اور اس سے بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بن
بیاہی اور کنواری رہنے والی عورتوں سے بہ نسبت بیاہے مردوں کے برے اور اہم آثار
ظاہر ہونے لازم ہیں کیونکہ تجرد کا مجرد رہنا اس میں فی الواقع اور نفس الامر چند ایسی نفسانی
حرکتیں پیدا کر دیتا ہے جو اس کے لیے مخصوص ہیں تاہم یہ حالت اس کی شخصی معیت اور
بناوٹ کو بالکل بدل نہیں دیتی۔ اس لیے مجرد رہنا مرد پر مطلقاً پاک دامنی کو واجب نہیں
بناتا بلکہ بصورت مجبوری وہ بیاہی عورتوں سے خلط ملط پیدا کر سکتا ہے۔ اس اعتبار سے تجرد
کے اس فرد یا قوی وظیفہ کو بالکل مٹا نہیں سکتا۔ مگر عورت کی حالت اس کے بالکل برعکس
ہے کیونکہ موجودہ سوسائٹی کی شرطیں بن بیاہی رہنے کی حالت میں بھی اس کی پاک دامنی کی
متقاضی ہیں۔ اور یہ پاکدامنی چاہتی ہے کہ عورت کے ماں بننے کا وظیفہ سرے سے حذف
کر دیا جائے جس کے واسطے جسمانی اور روحانی طور پر عورت پیدا کی گئی ہے اور اس میں
شک نہیں کہ عورت کی یہ حالت اس کی شخصیت کو بہت جلد خراب کر دے گی۔ اور بلاشبہ
ایسی عورتوں کی کثیر تعداد سوسائٹی کی ہیئت پر نہایت ہولناک اثر
ڈالے گی۔

اس مشہور عالم علم تمدن کا یہ قول دراصل بہت سے اقوال ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ جن سے ہمیں صاف
طور پر معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ یورپین مدنیت کی نسل میں بہت سی ایسی خوفناک علامتیں دکھائی دیتی

ہیں جو اس بات کا پتہ دے رہی ہیں کہ اس کے ڈھانچ کی پیچیدگیاں بہت جلد حل ہونے والی ہیں اور خاص کر عورتوں کی طرف سے اس نے جو ظاہر فریب ڈھچر بنا رکھا ہے۔ اس کا عقدہ سب سے پہلے کھلے گا۔ اس لیے اگر ہمیں کسی امر میں یورپ کی تقلید کرنا ایسا ہی ضروری ہے جس سے مفر نہیں، تو کم از کم ہمیں پہلے اس طریقہ کو جانچ لینا چاہیئے اور عقل و حکمت کے معیار پر اس کا کھوٹا کھرا پرکھ کر اس پر عمل کرنا چاہیئے تاکہ غلطی کھانے سے پہلے اور آفت میں مبتلا ہونے سے قبل ہی علیٰ وجہ البصیرت کام کر سکیں۔ ورنہ بعد میں پچھتانے سے کیا حاصل ہوگا۔ اور اگر ہمیں خود اتنی عقل نہیں کہ تمدن کے ان بڑے بڑے مسائل کو دور اندیشی کے معیار پر آزما سکیں جن کو قوموں کے مستقبل سے ارتباط ہوتا ہے تو آسان بات یہ ہے کہ اسی مدنیت کے نامور علماء کو اپنا رہنما بنائیں اور ان کے روزمرہ کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔

عورتوں کی آزادی والانے کا سب سے بڑا حامی اور پرجوش ممبر نیلسون نوریہ لکھتا ہے:۔

> آج عورت کی حالت کیا ہے؛ وہ ہر طرح محرومی اور مصیبت کی دنیا میں زندگی بسر کرتی ہے یہاں تک کہ دستکاری کے عالم میں بھی اسے پوری گنجائش اپنے کسبِ معاش کی نہیں ملتی۔ کیونکہ مرد نے اس میدان کے بھی ہر ایک گوشہ پر قبضہ کر لیا ہے یہاں تک کہ سلائی اور کشیدہ کاڑھنے کی صنعت جو محض عورتوں کو زیبا تھی، وہ بھی مرد کے قابو میں ہے اور عورت کو دیکھیئے تو وہ کشمکش زندگی میں مبتلا ہو کر سخت سے سخت محنت کے کاموں میں مصروف ہوتی ہے جو اس کی قوت سے باہر ہیں۔ پھر اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ بھی نہ ہو تو پھر آخر مال و دولت سے محروم عورتوں کے زندگی بسر کرنے کے مصادر اور کیا ہیں؛ آیا محض "نکاح"؟ یا اگر وہ حسین ہو تو ان کا حسن و جمال؟ بے شک غریب عورتوں کے بسر اوقات کا واحد ذریعہ کھلے بندوں یا چھپے ڈھکے صرف ہمبستری کے کام آنا ہے۔ اور یہی ایک ایسی تاریخ ہے جس کے وہ اہلِ علم آج تک عورتوں سے جھگڑ کر سر بہ گوشہ رہتے ہیں۔ اسی بدقسمتی نے عورتوں کو اس طرح کے تمدن اور شوہر کی غلامی میں گرفتار کیا ہے جس نے نجات پانے اور مقابلہ کرنے کے بارے میں وہ اب تک کچھ بھی غور نہیں کر سکیں۔ اور آیا عورتوں کی اس قسمت میں ہم کو کچھ بھی انصاف

کا شائبہ نظر آسکتا ہے ؟

اب کوئی بتائے کہ بیچاری عورت اتنی سخت مزاحمتوں کے جھرمٹ سے کیونکر نکل سکے اور نکل کر کہاں جائے؟ اگر کہا جاتا ہے کہ جس طرح انسان کی مادی حالت ہر زمانہ میں ترقی کرتی رہتی ہے ۔ اسی انداز سے اس کی اخلاقی کیفیت اور نرم دلی بھی بڑھتی رہتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں اس نازک جنس (عورت) کی قابلِ رحم حالت پر اشک حسرت نہ بہائے جائیں ۔ اور کیوں اس پر ترس نہ کھایا جائے ؟ کیا کوئی رحمدل آدمی یا جس کو ذرا بھی مہربانی کا احساس ہو اس بات کو قبول کر سکتا ہے کہ عورت روحانی اور جسمانی حیثیت سے جس وظیفۂ طبعی کے ادا کرنے کو پیدا کی گئی ہے اسے چھوڑ کر اس کسب معاش کی خوفی جنگ میں شریک ہو ۔ یہ صرف مرد کا حصہ ہونا چاہیئے ۔ لیکن عورت ان مزاحمتوں کی کشمکش سے نکل کر کہاں جائے جو محض مادی حالتوں کی حد تک ہی پہنچ کر نہیں رکتیں بلکہ باطنی حالتوں تک بھی تجاوز کر جاتی ہیں ؟ مشہور اقتصادی فیلسوف "پرودٔن" اپنی کتاب "ابتکار النظام" میں لکھتا ہے :۔

نوعِ انسانی کسی اخلاقی ، سیاسی اور علمی فکر میں عورت کی ہرگز زیرِ بار احسان نہیں۔ وہ علم کی سڑک پر بغیر عورت کی مساعدت کے چلی ہے اور اس نے خود ہی حیرت انگیز عجائبات ظاہر کیے ہیں ۔

علامہ پرودٔن یوں لکھتے ہیں :۔

اخلاقی دنیا میں عورت نے مرد کے ساتھ جو بازی کھیلی تھی وہ بجنسہ اس بازی کی طرح تھی جیسی آج دخانی طاقت سے چلنے والے کارخانوں میں کھیلنا چاہتی ہے ۔ اس لیے نہ اسے پہلے کچھ معتدبہ نفع حاصل ہوا اور نہ اب کوئی فائدہ ہونے کی توقع ہے اور کارخانوں میں مرد کے بالمقابل عورت کی ہستی صرف بعض چھوٹے چھوٹے آلات کی طرح پائی جاتی ہے ۔

نامور علامہ ژول سیمان نے ریویو آف ریویوز میں فرانس کے علامہ "لوزوویہ" کی کتاب پر ریویو کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"عورت کو عورت رہنا چاہیئے" یہ "میلو لوزوویہ" کا فقرہ ہے ۔ بیشک عورت کو عورت ہی رہنا چاہیئے ۔ کیونکہ وہ اسی صفت کے ذریعہ سے اپنی سعادت کو پا سکتی ہے اور

اسے اپنے سوا دوسرے شخص کو بھی بخش سکتی ہے اس لیے ہمیں عورتوں کی حالت سنوارنی چاہیے۔ نہ کہ اسے بالکل بدل دیں اور ہمیں مناسب ہے کہ عورتوں کو مرد بنا دینے سے پرہیز کریں کیونکہ اس کی وجہ سے وہ بہت بڑی خوبی اور بہتری کو ہاتھ سے کھو بیٹھیں گی۔ اور ہم بھی تمام باتوں کو گنوا دیں گے۔ بلاشبہ فطرت نے اپنی تمام مصنوعات کو کامل و اکمل بنایا ہے۔ ہمیں ان کی حالت پر غائر نگاہ ڈالنے اور صرف ان کے عمدہ بنانے کی ضرورت ہے۔ جس کے ساتھ ہی جو امور ہم کو قوانینِ قدرت سے دور ڈالنے والے یا اس کی مثل ہوں ان سے بچنے کی بھی حاجت ہے بعض فلاسفر کہتے ہیں کہ زندگی مصائب میں مبتلا ہونے کا نام ہے۔ مگر شاید ان کے قول کا موجب یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تمام زندگی میں کبھی محنت کا ذائقہ نہیں چکھا۔ لیکن میں کہتا ہوں۔ یہ بیشک زندگی بڑے لطف اور خوبی کی چیز ہے مگر اس شرط سے کہ عورت و مرد میں سے ہر ایک اس محل اور موقع کو اچھی طرح جان جائے، جسے خداوند پاک نے ان میں سے ہر ایک کے واسطے خاص بنایا ہے۔

سنہ ۱۸۹۵ء کے رسالہ ریویو آف ریویوز میں علامہ جیورم فریرو لکھتا ہے کہ :-

یورپ میں بہت سی ایسی عورتیں پائی جاتی ہیں جو ہر طرح مردوں کے ایسے کام کرنے سے شادی بیاہ کا جھگڑا بالکل چھوڑے بیٹھی ہیں۔ ان عورتوں کو عورت مرد کے سوا ایک تیسری جنس کا نمونہ کہنا چاہیئے کیونکہ وہ مرد سے ترکیب جسمانی اور طبیعت میں یکساں نہ ہونے کے باعث مرد نہیں کہی جا سکتیں اور عورت کے طبعی فرائض ادا نہ کرنے یا اس کے ایسے کام نہ کرنے سے عورت بھی نہیں رہیں۔

اس نامور استاد نے ایسی عورتوں کی حالت پر غائر نظر ڈال کر معلوم کیا ہے کہ ان کی بناوٹی زندگی بسر کرنے کی روش اور ان کا اپنے اس طبعی وظیفہ کے ادا کرنے سے باز آجانا جس کے لیے وہ جسمانی اور روحانی دونوں اعتباروں سے پیدا کی گئی تھیں۔ ان کے احساسات کو دوسری عورتوں کے احساسات کی نسبت متغیر کر چکا ہے اور ان کی حالت مالیخولیا کے مرض میں مبتلا ہونے والے مریضوں کی سی ہو گئی ہے۔ گویا انسانی فطرت اپنی تاثیر کی زبانِ حال سے ان پر یہ حجت قائم کرتی ہے کہ اگر تم نے میرے حقوق سے چشم پوشی کی تو میں نے بھی تم کو اس کی کافی سزا دی ہے۔ پھر پروفیسر ممدوح یوں لکھتا ہے :-

قدرتی طور پر عورت بیرونی کاموں میں دخل دے سکتی ہے؟

خداوند کریم نے مخلوقات کو نہایت مکمل نظام اور عمدہ اصول پر خلق فرمایا۔ ہر ایک مخلوق کو اس کی ضرورت کی تمام چیزیں عطا کیں، جیسے اعضا اس کے واسطے ہونے چاہئیں ویسے ہی اعضاء عنایت کیے۔ ہر ایک عضو میں ان کے حسبِ حال اور بقدرِ ضرورت اپنی خواہشیں پوری کر سکنے کی قابلیت ودیعت فرمائی۔ مثال کے طور پر بے زبان جانوروں کے دانتوں کے متعلق غور کرو تم کو معلوم ہو جائے گا۔ ان کے باہمی شکل و ترتیب میں بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ گھاس پھوس کھانے والے جانوروں کے دانت سادے اور تیز صرف نباتات چبانے کے لائق ہیں۔ گوشت خور حیوانوں کے دانت نوکدار اور ان کی داڑھیں مضبوط و تیز بنائی ہیں۔ تاکہ وہ اپنی غذا کو اچھی طرح نوچ کر چبا سکیں۔ غرضیکہ اسی طرح تمام مخلوقات کے اجزاء اور اعضاء میں ایک خاص ترتیب اور مناسب استعداد موجود ہے۔ جو ان کے روزمرہ کی ضروریاتِ زندگی میں کار آمد ہو سکتی ہے۔ تاریخ طبیعی کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہی مشاہدہ اس بات پر دلیل قائم کرنے کا بہت موزوں ذریعہ ہے کہ عورتوں کا مردوں کے کاروبار میں مصروف ہونا ان کے خلاف فطرت عمل کرنے کے ہم معنی اور اپنے دائرہ طبیعی سے نکل جانے کے مترادف ہے۔ پھر اگر اس خلاف ورزی پر ان کو مجبور بھی بنایا جائے تو یہ بات اس امر کا واضح نشان ہوگی کہ سنگِ دل اور بے رحم مرد نے اپنے کمزور اور نرم دل ساتھی کو کس طرح آفتوں میں مبتلا کیا ہے۔ اور اسے اس خارجی زندگی کے خطرناک میدان میں بھی بے رحمی کیساتھ دھکی دے دے کر پسپا کر رہا ہے۔

عورت کی خلقت اور اس کے سراپا کی بناوٹ اس بات پر صاف دلالت کرتی ہے کہ اسے مرد کی دنیا کے علاوہ ایک اور عالم میں زندگی بسر کرنا واجب ہے۔ ورنہ اس کی وہی مثال ہوگی جیسا کہ پروفیسر جوم فرید“

لکھتا ہے یعنی وہ مرد اور عورت کے مابین ایک تیسری جنس کا نمونہ بن جائے گی جس کی امتیازی علامتیں ترش روئی غمگینی اور دائمی پریشانی اور مالیخولیا ہوں گی۔

عورت کے احساسات پر نظر ڈالنے سے وہ مجسم رحمت و شفقت نظر آئے گی۔ اس کو نرم دلی اور محبت کا نمونہ پایا جائے گا۔ پھر عورت کے طبعی میلان کو دیکھا جائے تو وہ ایثار نفس پر آمادہ، دوسروں کی فائدہ رسانی میں کوشاں، فطرتاً نیکی اور احسان کرنے کی جانب راغب پائی جائے گی یہ سب مقتضیات خارجی دنیا کی معیشت کے بالکل منافی ہیں۔ کیونکہ خارجی زندگی باہمی کش مکش و ایک دوسرے پر تعدی، اور رکاوٹ اور دھینگا مشتی کے لیے تیار رہنے سے بسر ہوتی ہے۔ اس زندگی کا تمام تر دار و مدار سنگدلی پر ہے اس لیے نرم دل اور رحیم المزاج عورت اس جنگی لڑائی میں کیونکر شریک ہو سکتی ہے؟ اس کا رقیق دل ان آفت خیز سنگ دلی کے آثار کو کس طرح دیکھ سکتا ہے، جن کو مشاہدہ کر کے بڑے بڑے بہادروں کا زہرہ آب ہو جاتے ہیں یہی سبب ہے کہ جن ملکوں میں عورت کو مردوں کے ساتھ کاروبار میں شریک ہونے کی عام اجازت ہے وہاں عورت کی حالت نہایت قابلِ رحم اور اس کی بسر اوقات کا دائرہ بے حد تنگ ہے۔ چنانچہ خود فلاسفر "فوریہ" جو عورت کا بہت بڑا حامی ہے۔ اس کے متعلق یوں لکھتا ہے کہ:۔

> عورتیں کاروباری دنیا میں پھنس کر محنت کا ناقابل برداشت بوجھ اٹھاتی اور فاقہ و تنگ دستی میں ایام گزارتی رہتی ہیں۔

یا جس طرح علامہ "پرودن" ان کو کارخانوں میں بعض چھوٹے اور کم استعمال میں آنے والے آلات سے مشابہ بیان کرتا ہے ۱۸۹۰ء کے ریویو آف ریویوز میں اسی فلاسفر کا یہ قول بھی درج کیا گیا ہے کہ بہت سی عورتیں نہایت محنت کے ساتھ کام میں مصروف رہنے کے بعد بھی ایک دن میں صرف بیس سینٹم مزدوری حاصل کرتی ہیں جو ان کے ایک وقت کے ادنیٰ درجہ کے کھانے کو بھی پوری طرح کافی نہیں ہوتی یہ سب باتیں کیوں ہیں؟ اس لیے کہ عورت کسی طرح اور کبھی مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جہاں اس نے کسی مفید کام میں ہاتھ ڈالا کہ معاً مرد بھی اس میدان میں جا اترا اور عورت کو دھکے دے کر پیچھے ڈالتا ہوا اس سے آگے بڑھ گیا۔ چونکہ مرد میں جسمانی قوت کے ساتھ جرأت اور محنت برداشت کرنے کی بھی طاقت ہے اس لیے وہ ہر ایک کام میں عورت پر یقینی فوقیت حاصل کر لیتا ہے۔ حتیٰ کہ سلائی اور کنگھی چوٹی کے کاموں میں بھی مرد نے عورت کی روزی چھین لی ہے۔ آزادیٔ نسواں کے حامی کہا کرتے ہیں۔ کہ پھر یہ لیڈی ڈاکٹر

اور انجنیئر عورتیں یا بڑی بڑی ذی علم معلمہ اور اہلِ قلم عورتیں پیدا ہو سکتی ہیں اور مزید تر پڑھتے جاتے ہیں کیا
یہ عورتیں نہیں۔ مگر ہمارے پاس اس بات کا معقول جواب ہے کہ جو نہایت خوش قسمت عورتیں اوّل تو کم ہیں
اور جو ہیں ان پر مالدار ماں باپ نے انہیں کے برابر تول کر سونا خرچ کیا ہے۔ جب کہیں ان کو یہ مرتبہ حاصل
ہوا ہے۔ مگر اسی کے بالمقابل مفلس اور بھوکوں مرنے والی عورتوں کی تعداد پر نظر ڈالی جائے تو وہ لاکھوں
سے بھی بڑھ کر کروڑوں تک شمار کی جاسکیں گی اور پھر اسی کے ساتھ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ آیا وہ زنانہ ڈاکٹر
یا انجنیئر عورتیں اصولِ فطرت اور قوانینِ قدرت کے سامنے بھی سرِ تسلیم خم کرتی ہیں یا نہیں؟ غالباً اس کا
جواب زیادہ تر نفی میں ملے گا۔ اس وقت ہم دریافت کریں گے کہ کیوں صاحب! کیا ان عورتوں کو مناسب
نہ تھا کہ وہ بجائے خود ڈاکٹر اور انجنیئر بننے کے اگر چند عالی حوصلہ اور روشن خیال مرد ڈاکٹروں کی مائیں بنتیں
تو یہ صورت نوعِ انسانی کے حق میں زیادہ مفید ہوتی یا ان کی موجودہ حالت زیادہ نفع رساں ہے؟ افسوس!
جن نیک دل بیبیوں کا قدرتی فرض انسانی نسل کی افزائش اور تربیت تھا آج وہ ان کے دینے والے اصولوں پر بچوں
کی تربیت کرنا مان لیا گیا ہے۔ وہ ماں کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتی جاتی ہیں۔ یہ کیا غضب ہے؟ بیشک ایسی
سمجھ اور قوانینِ فطرت سے سرکشی کرنے میں شمار ہوں گی اور ان کو نوعِ انسانی کے کمال اور اس کی ترقی کا موجب
قرار دینا سخت غلطی ہوگی۔ فاضل مؤلف فرماتے ہیں:-

مگر اس کا کیا علاج ہے کہ نظامِ عالم کے اقتضا سے بہت سی عورتوں کو تنہا اور بے یار و مددگار
زندگی بسر کرنے سے سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کو اس بات کی ضرورت پیش آتی ہے کہ اپنے
بسر اوقات اور اپنے بچوں کی پرورش کے لیے کچھ محنت مزدوری کر کے چار پیسے پیدا کریں۔

ہم کہتے ہیں کہ ہمیں ایسی عورتوں کی حالتِ زار پر توجہ کر کے دیکھنا چاہیئے کہ ان کو تنگدستی اور پریشان
روزگاری میں مبتلا ہو کر قوانینِ فطرت کی خلاف ورزی کرنے سے محفوظ رکھنے کی کیا تدبیر کی جا سکتی ہے پھر مناسب
طریقوں سے ان کے گزر بسر کا سامان کر دینا چاہیئے جو ہمدردی انسانی کا مقتضی ہے۔ نہ یہ کہ الٹے انہیں بلا
میں پھنسانے کا سامان کریں اور اس کو تمدن کی خوشنما صورت قرار دے کر یہ مرض اور زیادہ بڑھ جائیں۔

بھلا ذرا دیر کے لیے ہندوستان کی ان عورتوں کی حالت پر غور و مہربانی کی نگاہ ڈالو جنہیں بیاہ شادی سے
پہلے ہی بلکہ مرد بننے کا شوق اس بات پر مجبور کر رہا ہے کہ دوپہر کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں اور
جیٹھ کی گرمی میں ریت پر اپنا پیٹ پالنے کے لیے محنت سے کام کیا کریں اور پھر بھی اپنی جان کو موت کے

چھل [illegible] واسطے صرف اتنی ہی جرأت کہاں سکیں جو ان کی تنگی ترشی سے وقت گزاری کا فائدہ دے کونسا دل ایسا ہوگا جو مستورات کی نازک جنس کو ایسی رنجیدہ حالت میں دیکھنا پسند کرے اور اسے بیسویں صدی کے زرین تمدن کا نظر فریب پہلو بتائے ؟

ہم بیان کر چکے ہیں کہ عورت کی ہر ایک چیز اور حیثیت اس بات کو بتاتی ہے کہ وہ مردوں کے کاروبار سے الگ تھلگ رہنے اور کسی دوسرے طبیعی وظیفہ کو ادا کرنے کے واسطے پیدا کی گئی ہے۔ دیکھو جس وقت عورت حاملہ ہوتی ہے۔ تو وہ ایسے دور میں ہوتی ہے جبکہ اسے اپنی ذات کی خبر گیری بہت ہوشیاری سے کرنی واجب ہے۔ ان دنوں وہ مختلف منظروں اور خاص کر خوف یا رنج دلانے والے منظروں کو دیکھ کر نہایت جلد متاثر ہو جایا کرتی ہے۔ اور [illegible] نے اس بارہ میں ضخیم ضخیم کتابیں تصنیف کی ہیں۔ پھر وہ دور ولادت میں منتقل ہوتے ہی واقعی بیمار پڑ جاتی ہے جس [illegible] دل [illegible] ہوتی ہے اور جیسی استعداد یا جیسا مزاج ہوتا ہے۔ اسی کے کم بیش تکلیف برداشت کرتی [illegible] ہے اور یہ ایسا زمانہ ہے کہ اس میں بچہ کی جان اور اس نازک وجود کی زندگی کا دارومدار [illegible] رہتا ہے۔ تو اب بتائیے کہ ایک سیاسی عورت جو پارلیمنٹ کی ممبر ہے، حاملہ ہونے کی حالت میں [illegible] ہوئی، اور جیسا کہ اکثر پارلیمنٹ کے ممبر کسی مباحثہ کے مجادلہ کی صورت اختیار کر لینے پہ آپس میں جوتی پیزار لات گھونسے چلانے لگتے ہیں، وہی کیفیت رونما ہو گئی تو اس بیچاری عورت پہ کیا گزرے گی ؟ یا وہ کسی قانون کی تنسیخ اور کسی دفعہ قانون کی ترمیم و تغیر پہ بحث کرنے کو کھڑی ہوئی تو کوئی خوش بیان مقرر اس کے معاوضہ کو اٹھا جس نے سینکڑوں قومی دلائل سے اس عورت کو ساکت بنا دیا، تو بتائیے کہ اس انفعال اور شرمندگی سے اس پہ کیا حالت طاری ہوگی ؟ جس سے اگر وہ حاملہ ہے۔ تو اس کے حمل میں ؟ اور دودھ پلاتی ہے تو اس کے دودھ میں فساد پیدا کرنے کا سخت اندیشہ رہتا ہے۔ افسوس ہے کہ خدا نے عورت کو سکون و آرام کی زندگی بسر کرنے کے واسطے بنایا۔ مگر ہم ناموسِ الٰہی اور قوانینِ فطرت پہ تعدی کر کے اسے جنگ، جدل اور کشمکشِ زندگی کے میدان میں کھینچ لانے کی کوشش کریں اور وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ کے فرمان کو اپنے حسبِ حال بنا لیں تو کیوں ؟

اچھا ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ بھی مانے لیتے کہ ساری دنیا نے ایک ساتھ عورت کو مردوں کے کام سنبھالنے کا مستحق قرار دینے میں نظامِ عالم کے تغیر کی کوئی پروا نہیں کی۔ اور اسے بالکل اس بات کا مجاز بنا دیا کہ وہ تمام

مردوں کے کاروبار اپنی گردن پر اٹھائے۔ تو کیا دینِ فطری (اسلام) کے پابندوں کے لیے بھی یہ بات مناسب ہے کہ وہ اس درجہ تک احکام فطرت کا معارضہ کرنے میں غیر اقوام کی تقلید کریں؛ کیا اگر ہم مذہب اور طبیعت و فطرت کے بتائے ہوئے طریقہ پر عورتوں کی اصلاحِ حال کا قانون مقرر کریں تو معزز مسلمان خاتون کے دل پر اس کا کوئی ناگوار بوجھ پڑے گا؛ افسوس۔ اب گویا ہم پر اُمید و فلاح کے دروازے ہر طرف سے بالکل بند ہو چکے ہیں، یہاں تک کہ ہم مجبور ہو کر دوسری قوموں کی مہلک بیماریوں میں بھی ان کی تقلید کرنے پر مستعد ہو گئے ہیں۔

عورتوں کا مردوں کے کاموں میں دخل دینا کسی ملک میں ہمیشہ ممکن ہے؟

خالقِ عالم ایک بات میں اس کا فیصلہ فرما چکا ہے کہ :-

"وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَہٗ" خدا کی حد بندیوں سے جس نے تجاوز کیا خود اپنے نفس پر ظلم کیا۔ جو لوگ عالمِ کون و فساد کے انقلاب کا علم رکھتے ہیں ان کا مقولہ ہے کہ طبیعت میں ایک ایسا خاص نظام موجود ہے کہ جہاں انسان اس کے حدود سے متجاوز ہونے یا اس کے توڑنے کا ارادہ کرتا ہے خود طبیعت ہی اسے فوراً روک دینے والی باتیں فراہم کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ یا انسان اس قصد سے باز آجاتا ہے یا اپنے کیے کی سزا پاتا ہے۔ جس وقت سے انسان کا وجود ہوا ہے اس دن سے آج تک اگر اس کی زندگی پر غور کیا جائے تو اس کو ایک عظیم الشان تعلیم گاہ کی طرح پایا جائے گا جس میں ہر وقت انسان کو راہ راست کے تلاش کی خواہش ہونے کی صورت میں تعلیم پانے کا موقع حاصل ہے۔

ہم اگلی بحث میں یہ مسئلہ بخوبی ثابت کر چکے ہیں کہ عورتوں کا مردوں کے اشغال میں شریک ہونا ایک معاشرت کی بیماری اور قوانینِ فطرت کی خلاف ورزی ہے۔ اور صرف ایک بحث اس امر کے ثبوت کیلئے کافی تھی۔ کہ گو اس ناموسِ الٰہی کی نافرمانی کو کیسے ہی خوش نما ظاہرداریوں سے چھپایا جائے تاہم اس کا ہمیشہ قائم رہنا محال ہے۔ لیکن زیادہ واضح کرنے کے خیال سے ہم پھر اس کی توضیح کرتے ہیں: نہ صرف ہم بلکہ تمام خاص و عام۔ یہاں تک کہ عالمِ وجود کا ایک ذرہ بھی جانتا ہے کہ عورت کے لیے ایک خاص کمال ایسا رکھا گیا ہے کہ جب تک وہ بیاہی ہوئی اور بچہ جننے والی، اس کو پرورش کرنے والی ماں اور خانہ داری کی منتظم نہ بنے۔ اس وقت تک کبھی وہ کمال حاصل ہی نہیں ہو سکتا اور جو چیز اس کو قدرتی فرض سے دور کرے گی وہ اس کے کمال میں بھی نقص وارد کر کے اس پر بُرا اثر ڈالے گی۔ ہمیں اس بات کا بھی علم ہے کہ انسانیت

ہر روز آگے ترقی کر رہی ہے پسپا نہیں ہو رہی ہے۔ اور یہ ترقی اسی وقت ممکن ہے جبکہ انسان کے سارے ارادے
اور حالات قوانینِ فطرت کے مطابق ہوتے رہیں۔ اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ کوئی قوم کامل نہیں بن سکتی تا وقتیکہ اس
میں کاموں کی تقسیم دو کارکن قوتوں کے حسبِ حال ہونی چاہیئے۔ یعنی استعداد اور خلقی فرائض۔ مثلاً اگر ہم سنیں
کہ فلاں قوم کی عورتیں خانہ داری کی زندگی کے دائرے سے نکل کر مردوں کے ساتھ سخت محنت کے کاموں
میں شریک ہوتی ہیں تو اگر ہماری آنکھیں بینا اور ہمارے دل صحیح ہوں۔ ہمیں اس بات کو ہرگز ایسا کمال تصور
نہ کرنا چاہیئے جس کے حاصل کرنے کے لیے ہم پر اس قوم کی پیروی واجب ہے بلکہ بجائے اس کے
ہمارا الیقینی فرض یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اس کو موجبِ ضرر تصور کر کے [illegible] رہنے کی کوشش کریں۔
کیونکہ یہ امر صحیح کمال کے منافی ہے۔ خواہ وہ قوم بہ نسبت ہمارے [illegible] کے بعض نمائشی حالتوں میں
فوقیت کیوں نہ رکھتی ہو۔ دنیا میں بہت سے تمدن قائم ہوئے۔ کچھ زمانہ تک ان کو فروغ ہوا اور [illegible]
زمین ان کے جادوؤں سے روشن ہو گئی پھر افرادِ قوم کی خلاف ورزی اور احکامِ فطرت کی خلاف [illegible]
سے آخر کار یوں مٹ گئے کہ گویا وجود ہی میں نہ آئے تھے۔ یہ ایک ایسا قضیہ ہے کہ خود [illegible]
کے مصنف بھی اس بارہ میں ہم سے مخالفت نہیں رکھتے۔ چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

> ہم اس بارہ میں بالکل اختلاف نہیں کرتے کہ فطرت نے عورت کو خانہ داری کے
> کاموں اور اپنی اولاد کی پرورش کے لیے پیدا کیا ہے، اور وہ [illegible] رضاعت
> کے ایسے سخت طبیعی عارضوں میں مبتلا ہوتے رہنے کی وجہ سے [illegible] کاموں کو نہیں کر سکتی
> جو مرد کر سکتے ہیں۔ بلکہ ہم اس مقام پر یہ بھی تصریح کر دیتے ہیں کہ سوسائٹی کی [illegible]
> بہترین خدمت جو عورت ادا کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ عورت بیاہی جائے، بچے جنے
> اور اپنی اولاد کی تربیت کرے۔ اور یہ ایسا بدیہی قضیہ ہے جس کے ثابت کرنے کے واسطے
> کسی طویل بحث کی حاجت نہیں۔

اس مقام پر مؤلف بھی ہماری طرح یہ مانتے ہیں کہ عورت کا کمال اسی میں ہے کہ وہ ایسی بیوی بنے
جس کے چند بچے ہوں اور پھر وہ ان کی تربیت میں مصروف ہو۔ لیکن اس بات کو لکھ کر وہ پھر بہک جاتے
ہیں اور لکھتے ہیں:۔

[illegible] غلطی تو یہ ہے کہ ہم اس کی بنیاد پر تمدن کے لیے ایسی تعلیم و تربیت کو لازم قرار دیں

جس کے ذریعے سے وہ بوقتِ ضرورت اپنی اور اپنے چھوٹے بچوں کی زندگی کے واسطے کسبِ معاش کر سکے۔

ہم کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی معاشرتی حالت یورپ کے طرزِ معاشرت سے ہر طرح جُداگانہ ہے اور جو شخص اس بات کی تحقیق کرنا چاہے۔ اس کو ادنیٰ تامل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان دونوں خطوں کا کسی تمدنی اصول میں یکساں اور ملتے جلتے ہونا اس وقت تک غیر ممکن ہے۔ جب تک کہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے جسم میں فنا ہو کر اسی کا ایک جزو نہ ہو جائے اس میں شک نہیں کہ فاضل مؤلف نے جو آخری جملہ لکھا ہے اگر یہ فقرہ یورپین ممالک میں کسی کی زبان سے نکلتا تو وہ وہاں کے ہر ایک دل میں اس کی بہت بڑی وقعت جم جاتی مگر اس وجہ سے نہیں کہ یہ بات کسی واجب الوصول کمال حاصل کرنے کی کوشش کا حکم دیتی ہے بلکہ اس لیے کہ یورپ میں کوئی گھرانا ایسا نہیں مل سکتا جس میں کوئی لڑکی یا عورت بذاتِ خاص خارجی کاموں میں شرکت کا حصہ نہ لے رہی ہو۔ یا اس رقم مہر کے جمع کرنے کی فکر نہ کرتی ہو، جسے وہ لازمی طور پر اپنے آئندہ شوہر کے پیش کرے گی۔ لیکن مشرقی ممالک ہمیشہ سے عورتوں کے بارہ میں کمال فطری کے درجہ سے بہت قریب رہتے آئے ہیں۔ اس لیے یہ فقرہ اس ملک میں ہرگز قبول عام کا مرتبہ نہیں حاصل کر سکتا۔ بلکہ یہاں معاملہ برعکس ہے۔ کیونکہ مشرقی ملکوں میں جتنے کنبے قبیلے ہیں وہ اس دن کو بے حد منحوس تصور کرتے ہیں جس میں اس کی کسی عورت کو خارجی کام کے لیے مجبور ہونا پڑے۔ اور خدا سے التجا کرتے رہتے ہیں کہ پروردگار ایسا روز بد آنے سے پہلے ہی ہم کو دنیا سے اٹھا لے۔

ایک یورپین شخص کو معلوم ہے کہ اس کے ملک میں ایسی عورتوں کی کثیر تعداد موجود ہے۔ جو اپنے کم سن بچوں کی پرورش اور اپنے بسر اوقات کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتیں۔ فاقہ اور تنگ دستی کی مصیبت نے ان کو زندگی سے بیزار اور موت کا طلب گار بنا دیا ہے۔ اور اکثر بیچاریاں بھوکوں مرنے کی آفت سے نجات پانے کے واسطے خودکشی بھی کر لیتی ہیں۔ اس لیے جب وہ مذکورہ بالا جملے کو سنے گا تو اس کے دل پر گہرا اثر پڑے گا اور اس کو لا محالہ یہ آرزو پیدا ہو جائے گی کہ کاش تعلیم کی وجہ سے ایسی ہی صورت ظہور میں آجاتی اور غریب عورتوں کو محرومانہ زندگی سے نجات مل جاتی مگر مشرق کا رہنے والا آدمی جس نے آج تک باوجود ہر حیثیت سے پستی اور ذلت میں گرفتار

ہونے کے ایسا رنجیدہ منظر نہیں دیکھا ہے، ضرور اس جملہ کو نہایت حقارت و نفرت سے دیکھے گا اور اس کو کبھی نہ مانے گا کیونکہ اس کے دل میں اسلام کی شریف روح کا اتنا اثر باقی ہوگا جو اسے خیال دلائے گا کہ کاش! ہمارے قومی مرد کسی دوسری تدبیر سے ان عورتوں کی تکلیف رفع کرنے کا سامان کرتے۔

عورت کو مردوں سے پردہ کرنا چاہیے؟

ہم ثابت کر چکے ہیں کہ عورت کے لیے دنیا میں ایک ایسا اعلیٰ کمال رکھا گیا ہے جس کے حاصل کرنے کی کوشش اس پر فرض ہے اور تجربہ کی واضح دلیلوں سے اس بات کو بھی دکھا چکے ہیں کہ عورت کا مردوں کے کاروبار میں مصروف ہونا اور خود اپنی روٹی کمانے کے لیے محنت و مشقت کرنا، علاوہ اس کے کہ اسے اپنے مرتبۂ کمال سے دور ڈال دیتا ہے، اس کی تمام ایسی خاصیتوں کے لیے بھی سم قاتل ہے جو اسے سعادت سے بہرہ ور کرتی ہیں۔ اور اس کی بربادی اور تباہی کا موجب یہی امر ہے۔ اور اس بات کا بھی فلسفی دلیلوں سے ثبوت دے چکے کہ عورت کو مرد کی ذمہ داری میں رہ کر اسے اپنی غذا اور سامانِ آسائش کی بہم رسانی پر مجبور کرنا چاہیئے اور اپنا کام صرف یہ سمجھنا چاہیئے کہ بچوں کی پرورش اور پرداخت کرے غرضیکہ ان سب باتوں کو پچھلی باتوں میں بوضاحت بیان کر چکنے کے بعد اب ہم یہ کہتے ہیں کہ ان تمام اہم حقوق کے مقام میں جو مرد پر عورت کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ مرد کا بھی کوئی حق اس پر ضرور ہونا چاہیئے۔ اور وہ حق یہ ہے کہ عورت مرد کی افسری مانے اور اسے اپنا سرتاج جانے۔ ورنہ اگر مرد پر اتنے واجبات کا بار ڈال کر اسے معاوضہ میں اپنا طبعی حق بھی نہ دیا جائے تو یہ بات نظامِ عالم کے اصول سے خلاف ہو گی بلکہ ہمارے خیال میں مرد کا یہ حق جو اس کو عورت پر حاصل ہے زیادہ واضح کرنے کا محتاج نہیں یہ ایک فطری احساس ہے جس کو خود عورت بلا کسی تحریک کے محسوس کر لیتی ہے۔ اور مرد بھی اس کا یہی شعور رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے عورت کو پردہ میں رکھنا یا اسے پردہ سے باہر نکال لانا خود مرد کے قابو کی بات ہے جس کو وہ بہ اعانتِ غیب جب دل چاہے کر سکتا ہے۔ یہ بالکل فضول سی بات ہے کہ ہم مرد پر اتنے اہم فرائض کا بار ڈالنے کے بعد پھر اسے ان حقوق سے بھی بے بہرہ بنانے کی سعی،

کریں جو اس کو اپنی بیوی پر حاصل ہونے چاہئیں۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے جو دنیا میں کبھی صورت پذیر ہی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ دنیا کا کاروبار اسی برتے پر چلتا ہے کہ اس کے تمام افراد میں تبادلۂ حقوق ہوتا ہے ہر ایک مخلوق ایک دوسرے پر کچھ نہ کچھ حق رکھتی ہے۔ اور ایک کی مدد و اعانت سے دوسرے کا کام چلتا ہے۔ اس لیے جو شخص صورت پر مرد کے حقوق قائم کرنے پر اعتراض کرتا ہے۔ وہ گویا خود قانونِ فطرت پر معترض ہے اور اگرچہ لاعلمی کی وجہ سے عام انسانوں کو قانونِ قدرت پر اعتراض کرنے کی عادت ہے تاہم اس کا بے نتیجہ فعل ہونا اظہر من الشمس ہے۔ ورنہ اگر انسان کسی چیز کے حاصل کرنے سے پہلے اس بات پر بھی غور کر لیا کرتا کہ آیا قانونِ قدرت کے بھی حسبِ منشاء ہے یا نہیں تو غالباً ہم کو اپنی لغتوں سے ناممکن کا لفظ نکال دینا پڑتا۔ اس لیے کہ دنیا میں کوئی چیز "محال" نہیں مگر وہ جو کہ قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔

عورت کو پردہ میں رکھنے یا پردہ سے باہر لانے کا حق براہِ راست مرد کو حاصل ہے۔ اور اس کی ایک کھلی ہوئی دلیل یہ ہے کہ عورتوں کو آزادی دلانے والے جب کبھی اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں یا اس آزادی دینے کا مطالبہ کرتے ہیں تو ان کا روئے سخن ہمیشہ مرد ہی کی جانب ہوتا ہے۔ کتاب "المرأۃ الجدیدہ" کے مؤلف تحریر فرماتے ہیں :-

> ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں اہلِ علم کے لیے اور خاص کر نوخیز تعلیم یافتہ جماعت کے لیے جس سے زمانۂ آئندہ میں ہماری امیدیں پوری ہونے کا سہارا وابستہ ہے۔ کیونکہ صرف یہی جماعت جس نے صحیح علمی تربیت حاصل کر لی ہے، اس بات کی قوت رکھتی ہے کہ ایک نہ ایک دن مسئلہ نسواں کو بحث اور توجہ کے اس مرکز پر لے آئے جس کا یہ مسئلہ مستحق ہے۔

کیوں اب اس جملہ کو پڑھ کر بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ عورتوں کی باگ مردوں کے قابو میں نہیں؛ اور یہ کہ مردوں کو اس بات کا اختیار ہے کہ جس راستے چاہیں عورتوں کو چلا سکتے ہیں۔ اور جس طریقہ پر ارادہ کریں ان سے اپنے حسبِ مرضی کام لے سکتے ہیں؟ کیونکہ اگر اس حیثیت سے عورتوں کا بھی کوئی ایسا طبیعی حق ہوتا ہے جیسے میزانِ عالم میں کوئی وزن حاصل ہو تو ضروری تھا کہ فاضل مؤلف ان کو اپنا صحیح مخاطب بنا کر ہدایت کرتے کہ عورتو! مردوں کی اطاعت کا جوا اپنی گردنوں سے اتار پھینکو بلکہ

وہ عورتیں خود ہی کیوں اس بات کی منتظر رہتیں کہ ان کا کوئی مرد حامی اٹھے۔ وہ آپ ہی مردوں کے چنگل سے نکل بھاگتیں۔ جو لوگ عورتوں کو مردوں کی اطاعت سے آزادی دلانے کے واسطے نالہ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے بعض کمزور اور محکوم اقوام کے کچھ افراد زبردست اور حکمران قوم کے غلبہ اور حکمرانی کو قبضہ ناصبانہ بنا کر اپنے استقلال اور آزادی کا غل مچاتے ہیں۔ مگر اس شور وغوغا کا اس وقت تک کوئی اثر نہیں ہو سکتا جب تک مغلوب قومیں خود کوئی ایسا وزن دار طبیعی حق نہ حاصل کریں۔ جو انہیں خودمختاری کے لائق بنا سکے۔ اس صورت میں عورتوں کو آزادی دلانے والوں کی تحریر ہی ہوا در ہوا سے زیادہ نہیں کیونکہ نہ عورتوں کو فطرتاً کوئی ایسا حق حاصل ہو گا اور نہ ان حضرات کی اُمید بر آئے گی۔ علاوہ بریں ہماری یہ مثال قیاس مع الفارق ہے کیونکہ وہ محکوم قومیں جدوجہد کے ذریعے سے اس فطری حق کو حاصل کرنے کی قوت رکھتی ہیں جس کے بعد انہیں حکمران قوم کی ماتحتی سے نکلنے کا موقع مل جائے گا۔ مگر عورتوں کی حالت اس کے برعکس ہے۔ عورتوں کا کمال اسی امر کا مقتضی ہے کہ مرد ان کی خدمت گزاری کریں۔ ان کی غذا اور راحت کا سامان بہم پہنچائیں۔ اور انہیں کسبِ معاش کی مہلک جنگ میں شریک ہونے کی آفت سے بچائیں۔ اتنی اور ایسی گراں بار خدمت بلاشبہ کسی معاوضہ کی بھی مستحق ہے... معاوضہ کیا ہے؟ یہی کہ مرد کو عورت پر افسری اور تحفظ کا حق دیا جائے۔ باوجود اس امر کے ہم یہ نہیں کہتے کہ عورتیں ایسی خودمختار نہیں ہو سکتیں جن کی آزادی پر مرد کا کوئی دباؤ نہ پڑ سکے۔ لیکن ایسی حالت میں مرد کو اس بات کی کچھ پروانہ ہوگی کہ عورت کے فرائض اور حقوق کا بار اپنے ذمہ لے۔ اس لئے وہ عورت کو اس کے حال پر چھوڑ دے گا۔ تاکہ عورت اپنے بسر اوقات کا آپ ہی سامان کرے۔ اور اس صورت میں عورت خارجی کاروبار میں مرد کی مزاحمت سے صدمہ اٹھائے گی۔ اور جس طرح آج سے ہزاروں سال قبل یا آج بھی وحشی قوموں میں دیکھا جاتا ہے، عورت آزاد اور خودمختار رہے گی۔ لیکن اسی کے ساتھ حد درجہ کی ذلیل و حقیر مخلوق بن کر۔ لہٰذا اگر عورتوں کو آزادی دلانے والے اصحاب اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ عورت کو ایسے جلتے ہوئے جہنم میں جھونک دیں تو ہم خدا سے التجا کریں گے کہ بارالٰہا تو یہ بلا ہم پر نازل نہ فرما۔

جن قوموں کی نسبت لوگوں کا گمان ہے کہ ان کی عورتیں اعلیٰ درجہ کی آزادی حاصل کر چکی ہیں اگر ان کی حالت پر سرسری طور سے بھی غور کیا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ وہ موہوم آزادی براہِ راست

مردوں کے قابو میں ہے۔ یعنی اگر آج وہاں کے مرد عورتوں کو گھروں میں بند کر دینا چاہیں تو عورتیں بجز اطاعت و تسلیم کے کچھ نہیں کر سکتی ہیں اور جس طرح وہ پہلے زمانہ سے آج تک ہمیشہ مردوں کی فرمانبرداری کرتی رہیں اور کرتی رہتی ہیں۔ اس بارہ میں کوئی انکار نہ کر سکیں گی۔ یہ ایسی حقیقتیں ہیں کہ خواہ کوئی اپنی زبان سے ان کا اقرار نہ کرے تاہم اس کا دل ضرور انہیں مان جائے گا اور اس کے بشرہ سے پتہ مل جائے گا۔ کہ ان کی صداقت اس کے قلب پر نقش فی الحجر ہو گئی ہے۔

کتاب "المراۃ الجدیدۃ" کے مؤلف فرماتے ہیں:۔

جب کہ مردوں کا معاملہ باعثِ فساد تھا تو اس کی کیا وجہ ہے کہ عورتوں کی آزادی پامال کی جاتی ہے اور مردوں کی خود مختاری عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے؟ کیا عورتوں اور مردوں کے بارہ میں انصاف کی مختلف دو نگاہیں ہونی چاہئیں۔ کیا ہر ایک ذی اختیار کو اس بات کی آزادی نہیں حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہے اپنا اختیار صرف کرے، بشرطیکہ اس کا فعل شرع و قانون کی حد سے آگے بڑھے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ بات بھی ویسی ہی فضول ہے جیسی محکوم اور مغلوب قوموں کی چیخ فریاد۔ وہ بھی تو یہی چلاتی رہتی ہیں کہ جب انسان کو زندگی کے میدان میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا جائز حق ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ کمزور اور محکوم قوموں کی راہ میں رکاوٹیں حائل کی جاتی ہیں۔ اور مفتوح قوموں کے بڑھنے کے لیے راستہ صاف بنایا جاتا ہے۔ کیا ان کے واسطے کچھ اور انصاف ہے اور ان کے لیے کچھ اور؟ کیا حاکم اور محکوم قوموں کے حقوق الگ الگ ہیں؟ کیا ہر ایک ذی اختیار کو اپنے جائز حق سے فائدہ اٹھانے کا پورا موقع نہیں دیا گیا ہے۔ بشرطیکہ وہ قانون کی حد سے تجاوز نہ کرے؟ وغیرہ وغیرہ اس لیے اگر ایسی نکائتیں کمزور قوموں کے لیے نافع ہوتیں اور انہیں زبردست قوموں کے ہاتھوں سے نجات دلا دیتیں تو ہم مان لیتے کہ عورتوں کی نسبت بھی ایک ایسا جملہ کوئی اثر دکھائے بغیر نہ رہتا۔

آخر اس کے مفید نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ اسرارِ فطرت کا معائنہ اور تجسس اور انسانی زندگی کے قوانین پر غور کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ دو چیزوں میں مساوات اسی وقت پائی جاتی ہے جبکہ ان کی قوت کافی اور یکساں ہو۔ یہ ایسا بدیہی قضیہ ہے جس کو ہر شخص اپنے معاملاتِ زندگی اور دوسری

قوموں کے بسر اوقات کی حالت میں مشاہدہ کر سکتا ہے۔ اس لیے ہمیں مساوات کا نام لے کر گفتگو کرنے
سے قبل یہ واجب ہے کہ اس بارہ میں قوت کی یکسانیت پر بھی لحاظ کریں اور ہمارے مخالفین کسی طرح اس
قانونِ قدرت کو ظالمانہ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ظلم اور سخت ظلم اس کا نام ہے کہ دو مختلف قوتیں رکھنے
والے افراد کو مساوی حقوق دلائے جائیں۔

ایسی باتوں کے غیر مفید ہونے کا فقط یہی ایک باعث نہیں جو ہم نے ذکر کیا ہے بلکہ ایک دوسری
بات یہ بھی ہے کہ وہ گفتگو کسی اور امر سے تعلق رکھتی ہے اور واقعی حقیقت کچھ اور ہے ماحصل یہ ہے کہ خداوند
کریم نے مرد و عورت کو الگ الگ کامل نہیں بنایا بلکہ دونوں کو ملا کر فردِ کامل بننے کے لیے پیدا فرمایا۔
مرد کی ذات میں چند بڑے نقصانات اور کمیاں ایسی ہیں جن کی تکمیل صرف عورت کرتی ہے۔ اور عورتوں
کی ذاتی کمی مرد کے ذریعے سے پوری ہوتی ہے۔ مگر اس کے لیے یہ امر بھی شرط ہے کہ باہم تبادلہ پذیر
کمیاں براہِ راست دونوں کے باہم ملنے کے وقت خود بخود مکمل ہو جایا کریں۔ اور وہ حالت بذاتِ خاص
دونوں میاں بیوی کو ان کے فرائض سے واقف بنا دے جو ایک دوسرے پر ہیں۔ جب یہ بات قرار
پا گئی تو اب دو ایسی چیزوں میں جو ہر ایک دوسری کی محتاج ہیں، مساوات کی حد مقرر کرنے پر بات
بڑھانا ایک بے معنی بات ہے اور ان دونوں میں سے ہر ایک کے علیحدہ علیحدہ مستقل ہونے کے مسئلہ پر
بحث کرنا ایک ایسی چیز ہے جو میری سمجھ میں مطلقاً نہیں آتی جو دو چیزیں مل کر ایک نئے ہونے کے
لیے پیدا کی گئی ہوں اور ہم ان کو الگ الگ بجائے خود مستقل بنانا چاہیں تو اس میں کیا خوبی نکل سکتی
ہے؟ جو دو چیزیں ایک دوسرے کی محتاج الیہ ہیں ان میں ہم مساوات کا درجہ کیونکر قائم کر سکتے ہیں؟
زیادہ سے زیادہ اس بارہ میں جو کچھ میں سمجھ سکتا ہوں وہ یہ بات ہے کہ جو لوگ مرد و عورت کو الگ
الگ مستقل بالذات بنانے کی کوشش کرتے ہیں ان کا مدعا وہ ایسے عنصروں کو مستقل بنانے کی جدوجہد
سے ملتا جلتا ہے جن کی آمیزش سے پانی بنتا ہے۔ یعنی وہ آکسیجن اور ہیڈروجن کی متفقہ قوت کو ہر
ایک کو مستقل بالذات بنانا چاہتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی آرزو رکھتے ہیں کہ یہ عناصر پانی بھی
بناتے رہیں۔ اس لیے اگر یہ بات ممکن ہے۔ تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ مرد و عورت الگ الگ مستقل ہو
جانے کے باوجود گھرانے کی بھی تکمیل کریں۔

ہاں! اس موقع پر لوگ یہ کہیں کہ جب تم عورت و مرد کو ایک ہی چیز یا ایک دوسرے کا محتاج الیہ

قرار دیتے ہو تو پھر پہلے ابواب میں خود تم نے ہی ان کے الگ الگ مرکز کیوں مقرر کیے ہیں۔ اور ان کو مختلف
بنانے کی کیوں کوشش کی ہے؛ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا یہ فعل بجنسہ اس کیمیا ساز کے عمل سے مشابہ تھا
جو آکسیجن کے نوعی وزن اور اس کے پیدا ہونے کے اسباب اور ہیڈروجن کے خواص و حالات کی الگ
الگ جانچ اور تحقیقات کرتا ہے۔ ایسلیے اگر ہم نے عورت کو بہ نسبت مرد کے کمزور بیان کیا تو ایک عالم علم کیمیا بھی یہی کہتا
ہے کہ آکسیجن بہ نسبت ہیڈروجن کے زیادہ وزنی ہوتا ہے اور اگر ہم نے یہ کہا ہے کہ زندگی کا وزن قائم رکھنے والا قانون اور جنس
نازک (عورت) کی بہتری صرف اسی امر کی مقتضی ہے کہ گھر کی بنیاد رکھنے میں عورت کی بہ نسبت مرد کے کئی حصے زیادہ اپنی آزادی کو قربانی
چڑھائے تو فن کیمیا کا ایک ماہر بھی کہے گا کہ پانی بنانے کیلیے ہیڈروجن کو بمقابلہ آکسیجن کے اپنی زیادہ مقدار صرف کرنی پڑتی ہے۔

یہ سخت حیرت کی بات ہے کہ عورتوں کی آزادی دلانے کے خواہشمند حضرات اس بات کو نہایت
بُری بات تصور کرتے ہیں۔ کہ عورت مرد کی تابع ہے۔ اور اسے عبودیت اور اسیری کی زندگی سے تعبیر کرتے
ہیں۔ مگر اس پر ذرا دیر کے لیے بھی غور نہیں کرتے کہ مرد اپنی عورت کے نان و نفقہ کے لیے کس قدر محنت
اور مشقت اٹھاتا، اپنے تئیں جان جوکھوں میں ڈالتا اور اپنا آرام کھوتا ہے۔ گویا مرد کی یہ محنت کوئی ہستی
ہی نہیں رکھتی؛ اسی کے ساتھ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے ایک طرف عورت کی اطاعت اور دوسری طرف
ان روحانی اور جسمانی محنتوں اور تکلیفوں کو جو اپنی عورت کی آرام رسانی کے لیے برداشت کرتا ہے ایک
دوسرے کے مقابلہ پر رکھ دیں تو ہمیں صاف نظر آجائے گا کہ عورت کی غلامی محض نام کے لیے ہے ورنہ
دراصل مرد عورت کا غلام بلکہ غلام سے بھی بڑھ کر ہے۔ ہاں بکثرت دیکھا جاتا ہے کہ عورت پر مرد کی
اطاعت کا بار اس کے لیے رنج والم کا باعث اور پریشانی و اضطراب کا موجب ہے۔ تو یہ صرف ان دونوں
کی باہمی نادانی اور حماقت کا کرشمہ ہے۔ ورنہ تہذیب و تربیت سے آراستہ بیویوں اور شوہروں میں سے
ہر ایک دوسرے کی نظر میں معزز بن جاتا ہے اور خود ان کی طبیعتیں اپنے اپنے فرائض متعین اور تقسیم کر لیتی
ہیں جس کے بعد "استقلال"، "آزادی اور مختاری کے لفظ ان کے خیال میں بھی نہیں آتے۔ کیونکہ دو مخلوق
جو ایک دوسرے کی تکمیل کرنے اور باہم مل کر رہنے کے لیے ان کے مابین یہ الفاظ بے معنی ہیں۔ ان تمام
باتوں کے مقرر ہو جانے اور ثابت ہو جانے کے بعد کہ مرد و عورت ایک دوسرے کے بالمقابل کوئی
آزادی نہیں رکھتے بلکہ وہ دونوں ایک ہی شے ہیں۔ اب عورت کے پردہ میں رہنے کا مسئلہ اس کے اور
مرد کے مابین حق مشترک بن گیا۔ اس لیے تنہا عورت کو پردہ کی رسم مٹا دینے کا حق نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ

مرد بھی اس بات کو نہ مان سے۔

اب یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جیسا لوگ کہا کرتے ہیں کہ پردہ دراصل ذلت اور اسیری کی علامت ہے؟ اور کیا پردہ عورت کو اس کے درجہ کمال تک پہنچنے سے روکتا ہے؟ اس لیے کیا کوئی ایسا دن آئے گا جب کہ پردہ کی پردہ دری ہو جائے؟ اس کے جواب میں آگے ملاحظہ فرمائیے۔

پردہ قید کی علامت ہے یا آزادی کی ضمانت؟

گزشتہ ابواب میں ہم نے بہت تشریح کے ساتھ عورت کی ماہیت اور اس کے کمال کو بیان کر دیا ہے اور تجربہ کی دلیلوں سے ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ کمال عورت کو جب ہی حاصل ہو سکتا ہے جبکہ وہ مردوں کے کاموں میں دخل نہ دے۔ ہم نے بڑی چھان بین کیساتھ ان مضرتوں کو بھی دکھایا ہے جو عورت و مرد دونوں جنسوں کے باہم میل جول سے روزمرہ ظہور میں آتی رہتی ہیں۔ اور اس باب میں ہمارا یہ ارادہ ہے کہ ہم عورت کے استقلال اس کی آزادی اور اسے مرد کے بے جا غلبہ سے باز رکھنے کا واحد ذریعہ اور آلہ پردہ کو ثابت کر دکھائیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ جس وقت ہم ایک ایسے عمرانی موضوع پر بحث کر رہے ہوں، جیسا مسئلہ نسواں ہے تو ہمیں اس چند روزہ مادی مدنیت کے نظر فریب چمک دمک سے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے۔ اور جب تک ہر چیز کی اچھی طرح چھان بین نہ کر لیں اُس وقت تک اس کو حکم قائم کرنے کا اصول قرار نہ دینا چاہیئے۔ اس بیان سے ہماری مراد یہ ہے کہ یورپ کے تمدن کی جس ظاہر فریب نمائش سے یورپین عورتیں لطف اٹھا رہی ہیں۔ اس کے دلفریب رنگ کو تختہ اور لازوال تصور کرنا ٹھیک نہیں۔ یہ ایک عمرانی غلطی ہے جو متجسس آدمی کو چار و ناچار بعض ایسی بے معنی اور سطحی ادراکات کی طرف کھینچ لے جاتی ہے جن کو حقیقت اور واقعیت سے کچھ بھی لگاؤ نہیں ہوتا اور اگر بحالتِ موجودہ کچھ عرصے کے لیے وہ مذاق بھی ہو جائے تو زمانہ آئندہ میں جو کچھ دور نہیں پھر اُس کی ناموافقت عیاں ہو جائے گی۔ اس لیے وہ فطرتِ بشری سے منطبق نہیں ہوتی اور گو مرد کی غیرت تھوڑی دیر کے لیے لہو و لعب کی خاک میں دب گئی ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ بالکل فنا ہو چکی۔ نہیں کسی نہ کسی دن پھر اس کا شعلہ بھڑکے گا اور اس وقت عورتوں کی تمام آزادی

کو جلا کر خاک سیاہ بنا ڈالے گا۔ جن لوگوں نے انسان اور انسانیت کی مجموعی حالتوں پر عام نظر نہ ڈالی ہوگی، ان کو میری یہ بات شاعرانہ خیالات کی طرح بیکار بلند پروازی معلوم ہوگی لیکن کچھ ایسے لوگ بھی ملیں گے جو میری اس بات کو حقیقتاً صحیح اور عقل کے نزدیک قابل پسند سمجھنے کے علاوہ تاریخی شواہد سے مدلل بھی تصور کریں گے۔ چنانچہ اس مقام پر ہم مثلاً رومن امپائر کی حالت کا نقشہ کھینچ کر دکھاتے ہیں۔ کون رومن امپائر؟ جو تمام دول یورپ کی ماں ہے۔ اور وہ پہلا سرچشمہ ہے جس سے موجودہ یورپ کی متمدن دولِ عظام کی نہریں نکلیں۔ رومن حکومت کی بنیاد شہر روما میں چھ(۶) صدی قبل مسیح پڑی تھی۔ ابتداء یہ حکومت بہت چھوٹی، مفلس اور بے حقیقت تھی۔ پھر کئی صدیوں تک رفتہ رفتہ ترقی کرتی ہوئی تمدن و تہذیب کے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئی۔ اس حکومت میں بھی عورتیں پردہ کی قید رکھی جاتی تھیں۔ انیسویں صدی کی انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے:۔

> رومانیوں کی عورتیں بھی اسی طرح کام کاج کو پسند کرتی تھیں جس طرح مرد پسند کرتے ہیں۔ اور وہ اپنے گھروں میں کام کرتی رہتی تھیں۔ ان کے شوہر اور باپ بھائی صرف میدانِ جنگ میں سرفروشی کرتے رہتے تھے۔ خانہ داری کے کاموں سے فراغت پانے کے بعد عورتوں کے اہم کام یہ تھے کہ وہ سوت کاتیں اور ان کو صاف کر کے اس کے کپڑے بنائیں۔ رومانی عورتیں نہایت سخت پردہ کیا کرتی تھیں یہاں تک کہ ان میں جو عورت دایہ گیری کا کام کرتی تھی وہ اپنے گھر سے نکلتے وقت بھاری نقاب سے اپنا چہرہ چھپا لیتی اور اس کے اوپر ایک موٹی لمبی چادر اوڑھتی جو ایڑی تک لٹکتی رہتی۔ پھر اس چادر پر بھی ایک قبا، اوپر اوڑھی جاتی جس کے سبب سے اس کی شکل کا نظر آنا تو کیا جسم کی بناوٹ کا بھی پتہ لگنا مشکل ہوتا تھا۔

اس زمانہ میں جبکہ رومانیوں کی عورتیں پردہ میں رہا کرتی تھیں۔ اس قوم نے ہر فن و جملہ کمالات میں بے نظیر ترقیاں کیں۔ بت تراشی، عمارت سازی، فتوحاتِ ملکی، سلطنت و حکومت، عزت و عظمت اور علم و ہنر میں ساری دنیا کی قومیں رومانیوں کے مقابل ہیچ ہوگئیں۔ لیکن اس مرتبہ پر پہنچنے کے بعد ان میں عیش پرستی اور کھیل تفریح کا شوق پیدا ہوا جس کے ضمن میں انہوں نے اپنی عورتوں کو پردہ کی قید سے آزادی بخشی تاکہ وہ بھی ان کے ساتھ لہو و لعب اور سیر و تفریح کی مجلسوں، دنگلوں اور کھاڑوں(؟)

میں شریک ہوں۔ عورتیں پردہ سے نکلیں لیکن کیونکر؟ اس طرح جیسے پہلو سے دل نکل جاتا ہے۔ پھر کیا تھا اُسی حملہ آور عنصر (مرد) نے موقع پایا کہ محض اپنے حظِ نفس کے لیے ان کے اخلاق خراب کر کے ان کی پاکیزگی کے دامن پہ داغ لگائے اور ان کی شرم وحیا کو توڑا۔ یہاں تک کہ پھر وہی عورتیں جو سات پردوں میں رہا کرتی تھیں۔ تھیٹروں میں جانے لگیں۔ بال اور رقص کے جلسوں میں عورتوں کے ناچنے اور گانے کا شغل ایجاد ہوا۔ آخر عورتوں کی حکومت اس قدر قوی ہوئی کہ جو نامور مدبرِ ملک داری اور انتظام سلطنت کے لیے پارلیمنٹ یا سینٹ کی مجلس میں ممبر منتخب ہوا کرتے تھے۔ وہ بھی عورتوں کے ووٹ حاصل کرنے سے مقرر ہونے اور ان کے معمولی اشاروں پہ اپنے عہدوں سے معزول کر دیئے جانے لگے۔ بس یہ حالت ثابت ہوتے ہی روحانی حکومت کی بربادی شروع ہو گئی اور اس پہ ایسی تباہی آئی کہ تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص اس بات کو دیکھ کر حیرت زدہ اور مبہوت ہو جاتا ہے کہ رومانی حکومت کے اس شاندار قصر اور مستحکم عمارت کی انہیں عورت کے نازک ہاتھوں نے کس طرح ایک ایک اینٹ اکھیڑ کر رکھ دی اور اس کی ساری عظمت و متانت خاک میں ملا دی۔ کیا یہ بات عورتوں نے اپنی بدتمیزی اور بداخلاقی سے کی؟ نہیں ان کا اس میں کوئی قصور نہ تھا۔ مگر بات یہ ہوئی کہ انہیں بے پردہ بنایا گیا تو باقتضائے فطرت مرد ان پہ مائل ہونے لگے اور اس کے لیے آپس میں کٹنا مرنا شروع کر دیا۔ یہ ایک ایسی سیاسی حقیقت ہے جس کے ماننے میں کوئی شخص بحث ہی نہیں کر سکتا۔ علامہ "لوئس پیرول" ریویو آف ریویوز جلد ۱۲ میں "پولیٹیکل فساد" کے عنوان سے لکھتا ہے:۔

> سیاسی امور اور پولیٹیکل اصول میں خرابی پڑنے کی مثالیں ہر ایک زمانے میں یکساں پائی گئی ہیں۔ اور جو بات سخت حیرت میں ڈال دینے والی ہے وہ یہ ہے کہ اگلے زمانہ میں اس فساد کی علامتیں جو پائی گئی تھیں وہ آج کل بھی بجنسہٖ نظر آ رہی ہیں یعنی یہ کہ اعلیٰ درجہ کے اخلاق کی بنیادیں منہدم کرنے میں سب سے زبردست کارکن عورت رہی ہے۔

مگر ہمارے خیال میں اس فاضل مضمون نگار کو فساد ڈالنے کا الزام عورت کے ذمہ عائد کرنے سے باز آنا بہتر تھا۔ کیونکہ عورت بذاتِ خاص ہرگز مفسدہ پرداز نہیں۔ بلکہ مفسدہ انگیزی اور شرارت مرد کا حق ہے البتہ وہ اپنی اس کینہ خواہش کو پورا کرنے کے لیے عورت کو ایک ذریعہ بنا لیتا ہے۔ اور اس سے جال بچھانے کا کام لیتا ہے۔ پھر آگے چل کر فاضل مضمون نگار نے موجودہ ایام کی خوف دلانے والی علامتوں کو ان

علامات سے ملانا شروع کیا ہے جو رومن امپائر کی جمہوری حکومت میں پیدا ہوئی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ لکھتا ہے:۔

رومانی جمہوری حکومت کے پچھلے دور میں مدبّرانِ سلطنت اور اعیانِ مملکت نازک مزاج اور عیش پسند عورتوں کی صحبت بہت پسند کرنے لگے تھے۔ اور ایسی عورتیں ان دنوں بکثرت پائی جاتی تھیں۔ بس وہی حالت جو ان دنوں تھی یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ عورتوں کی طرف نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ عیش پسندی اور آرائش و زیبائش کے پیچھے پڑی جاتی ہیں اور یہ شوق انہیں جنون کے درجہ تک پہنچ گیا ہے۔

اخبار گزٹ بتائے کہ رومانی قوم کو اس کی عظمت و بڑائی کی محبت نے ترقی و تمدن کے اعلیٰ زینہ پر پہنچا دیا ہے، پھر بلندیوں کے زینوں سے جا کر تنزل اور ادبار کے تاریک غار میں کیوں گر گئی؟ اسے اتنی ترقی اور عظمت حاصل کرنے کے بعد تباہی و ذلت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے کیوں شرم نہیں آتی؟ یہ تصور ہو سکتا ہے کہ ایک ایسی قوم جو اپنے عروج و عظمت کے عہد میں عورتوں کو سخت پردہ کی پابند رکھتی تھی۔ آخر اس بات پر راضی ہو گئی کہ اس کی وہی خانہ نشین عورتیں بادشاہوں اور وزیروں کو جس وقت چاہیں ان کے عہدوں سے معزول کر دیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ حیرت انگیز انقلاب کیونکر ہوا۔ ضرور ہے کہ یہ انقلاب تدریجی رفتار سے ظہور میں آیا ہو۔ بے شک یہ حالت رفتہ رفتہ نشوونما پاتی رہی اور ناموس طبیعی کی بنیاد پر اس کا طوفان تدریجی رفتار سے بڑھتا گیا۔ پہلے اس معاملے کو کچھ وقعت نہیں دی گئی۔ پھر جب یہ آگ اندر ہی اندر سلگ کر شعلہ زن ہوئی تو ملک بیماری کے مانند یکبارگی جسم و جان کو جلا کر سیاہ بنا گئی۔ انیسویں صدی کی انسائیکلوپیڈیا کا مصنف لکھتا ہے:۔

"عورتوں میں عیش پسندی اور بناؤ سنگار کی مجنونانہ محبت صرف اس زمانہ میں بڑھی جو رومن حکومت کی شہنشاہی کا دور تھا۔ ورنہ جس وقت رومانی سلطنت ایک جمہوری حکومت تھی۔ ان دنوں عورت کی زندگی منزلی دائرہ ہی میں محدود تھی۔ اور وہ گھر میں بیٹھی ہوئی اُن کا سوت کاتا کرتی تھی۔ مگر روما کے ملک میں آرام پسندی کو رفتہ رفتہ ترقی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ مشہور رومانی فلاسفر کاٹو اپنی قوم کو اس خطرہ سے ڈرانے پر کمربستہ ہو گیا جو ایک دن ان پر بربادی لانے والا تھا۔"

اس زمانہ میں کاٹن نے وہی کام کیا جو آج ہمارے ملک میں پردۂ نسواں کے طرفدار کر رہے ہیں۔ سچ ہے تاریخ پلٹ پلٹ کر اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ مگر کاٹن کی نصیحت اس وقت مفید نہ پڑی۔ چنانچہ اس کے تھوڑے ہی دن بعد رومانیوں کے امارت کے ٹھاٹھ اور ان کی عشرت پرستی حد سے گزر گئی۔ اس کے بعد مصنّف کتاب نے رومانیوں کے لباس کی قسمیں اور عورتوں کے بناؤ سنگار کی وضعوں کا مفصل حال تحریر کیا ہے۔ جس کے بیان کرنے کا کوئی نفع نہیں تھا۔ اس لیے ہم اسے چھوڑ کر یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ کاٹن نے اپنی قوم سے کیا کہا تھا۔ اور ان کو پردہ کی رسم مٹانے کے خطرات سے کس طرح ڈرایا تھا۔ پھر اس کے تمام قوال کیونکر صحیح اور پورے اترے۔ یہ سب ایسے تاریخی واقعات ہیں جو ہمارے سوا اور قوموں پر گزر چکے ہیں۔ اس لیے ہم پر واجب ہے کہ ان کو بخوبی ذہن نشین کر لیں۔ کیونکہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ اس وقت ہم ایک خطرناک راستہ پر چل رہے ہیں۔

انیسویں صدی کی انسائیکلوپیڈیا کا مصنف لکھتا ہے کہ جس وقت رومانیوں نے اس قانون کو منسوخ کرانے کے مقصد سے بغاوت اور شورش برپا کی جو عورتوں کے بناؤ سنگار کی حد مقرر کرنے کے واسطے پاس ہوا تھا تو روما کا مشہور عالم و حکیم جو دو سو سال قبل مسیح گزرا ہے اپنے قوم کے مجمع میں کھڑا ہو کر ان سے کہنے لگا۔

> روما کے رہنے والو! کیا تم کو یہ وہم پیدا ہو گیا ہے۔ کہ اگر تم عورتوں کو ان بندشوں کے توڑ پھینکنے کی قوت دو گے جو انہیں اس وقت پوری طرح خود مختاری نہیں دیتی ہیں اور جو انہیں مجبوراً اپنے شوہروں کی مطیع بنائے ہوئے ہیں۔ تو ان کی نازبرداری اور ان کا راضی رکھ سکنا ایک آسان کام ہو گا۔ کیا آج باوجود ان بندشوں کے بھی ہم ان سے مشکل ان فرائض اور واجبات کی پابندی نہیں کرا سکتے جو ان کے ذمہ رکھے گئے ہیں؟ کیا تمہارے خیال میں یہ بات نہیں آتی کہ آگے چل کر عورتیں ہماری برابری کا دعویٰ کریں گی۔ اور ہم کو اپنی اطاعت پر مجبور کر لیں گی؟ تم ہی بتاؤ کہ عورتوں نے جو شورش برپا کی ہے اور جیسا بغاوت انگیز اجتماع کیا ہے وہ اپنے تئیں اس جرم سے بری ثابت کرنے کے لیے کونسی معقول حجت پیش کر سکتی ہیں؟ سنو! ان ہی عورتوں میں سے ایک عورت نے خود مجھ کو یہ جواب دیا تھا کہ "ہماری خوشی یہ ہے کہ ہم سر سے پاؤں تک سونے میں لدی ہوئی اور

خوش نما قرمزی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تیوہاروں کے دن اور تمام دوسرے دنوں میں شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر سیر کریں۔ اور خوشنما گاڑیوں پر سوار ہو کر اس منسوخ شدہ قانون پر، جس کا منشاء یہ تھا کہ عورتیں بہت تبدل نہ ہوں) اپنی فتح مندی ظاہر کرنے کے لیے سیر کو نکلیں۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ جس طرح تم مردوں کو انتخاب حکام کی آزادی ہے۔ ویسی ہی ہم کو بھی آزادی ملے۔ ہمارے ووٹ لیے جائیں۔ (موجودہ حالت اس وقت سے کس قدر مشابہ ہے) اور ہمارا یہ بھی مقصد ہے کہ ہمارے اخراجات اور زیب وزینت کے سامان کی کوئی حد مقرر نہ ہو۔

رومانیو تم نے مجھے اکثر مردوں اور عورتوں کی فضول خرچی کا شاکی پایا ہو گا بلکہ میں نے عام لوگوں اور خود قانون دان اور قانون ساز اصحاب کی فضول خرچی کی شکایت بھی کی ہو گی۔ تم نے میری زبان سے اکثر یہ بات سنی ہو گی۔ کہ ہماری جمہوری حکومت دو متناقض بیماریوں میں مبتلا ہے۔ ایک کنجوسی اور دوسری عیش پسندی۔ یاد رکھو کہ انہیں دونوں بیماریوں نے بڑے بڑے متمدن اور ترقی یافتہ ملکوں کا ستیاناس کر ڈالا ہے۔ اور ڈر ہے کہ یہی روز بد تم پر بھی آنے والا ہے۔

اس کے بعد انسائیکلوپیڈیا کے مصنف نے اپنی جانب سے کاٹن کی اس تقریر پر اتنا حاشیہ چڑھایا ہے:۔

کاٹن کو اس بارہ میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اور وہ قانون منسوخ ہونے سے نہ بچ سکا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جن باتوں سے کاٹن نے قوم کو خوف دلایا تھا، وہ حرف بہ حرف پوری اتریں۔

ہماری موجودہ معاشرت جس سے عورتوں کو حد سے بڑھی ہوئی آزادی نصیب ہے اسکی حالت پر بھی نظر ڈالنے سے دکھائی دیتا ہے کہ عورتوں کی کمینہ خواہش اور ان کا لغو شوق انہیں ہمیشہ اپنی آرائش اور بناؤ سنگار پر مائل رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ جو چیز ان کی خوبصورتی اور خوشنمائی کو بڑھائے اس کے حاصل کرنے کے لیے ان پر دیوانگی کا عالم طاری ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں اس حالت سے کہیں بڑھ کر خطرناک اور خوف دلانے والی ہیں۔ جو روما کے ملک کی بیان ہوئی ہیں۔ خیر ہم اس کو بھی چھوڑ دیتے ہیں اور اب

یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ رومانی سلطنت کی بنیاد ہلنے اور اس میں خلل واقع ہونے سے پہلے یہ صورت باقی رہی۔ کیا پھر بھی وہاں کی عورتیں عروج تک کے زمانہ کی طرح برابر ہونے میں لگتی ہوئی [illegible] رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے سڑکوں پر پھرتی، در اصل دنیا کی گاڑیوں میں بیٹھ کر نکلتی رہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ [illegible] یہ منظر پیش نگاہ ہوگا کہ رومانی مردوں نے اپنی عورتوں پر گوشت خوری، ہنسنا، بولنا [illegible] حرام قرار دے دیا یہاں تک کہ ان کے منہ پر "فذ میر" نامی ایک قفل لگا دیا تاکہ وہ گفتگو نہ پائے۔ یہ حالت صرف عام عورتوں کی نہیں ہوئی بلکہ رئیس و امیر گھرانے، شریف، عالم و جاہل سب کی عورتوں پر یہی آفت طاری ہوئی۔ پھر عورت کی اسیری اس سے بھی بڑھی حتیٰ کہ سترھویں صدی عیسوی کے زمانہ میں خاص روما میں اعلیٰ درجے کے قابل اور فاضل آدمیوں کا ایک جلسہ فراہم ہوا جس میں یہ سوال پیش کیا گیا کہ "آیا عورت میں بھی جان ہے؟"

اگر میں ناظرین سے وہ کیفیتیں بیان کرنا چاہوں جو عورتوں کے جرائم کی تحقیقات میں ظہور پذیر ہوئی تھیں یا جس طرح کے مختلف آلات اور شیطانی حرکات ان غریبوں کی ایذا دہی کے واسطے استعمال کیے جاتے تھے تو میرے دل میں نہ اس قدر قوت ہے کہ ان کو بیان کر سکوں اور نہ قلم میں اتنی طاقت کہ وہ لکھ سکے۔ ہاں! اگر کوئی مصور اس قدر جرأت کرے کہ وہ ان مجرمہ عورتوں کی تصویر کھینچ دے جن کے جسم پر قطران ٹپکایا جاتا تھا۔ جو گھوڑوں کے ساتھ باندھ کر گھسیٹی جاتی تھیں اور گھوڑے سرعت سے دوڑتے پھرتے تھے جس سے ان بے چاریوں کی ہڈیاں پسلیاں تک چور چور ہو جاتی تھیں یا جو بہت سی عورتیں ستونوں سے باندھ دی جایا کرتی تھیں۔ اور ان کے نیچے آگ روشن کر دی جاتی جس کی سوزش سے ان کا گوشت گل گل کر گرتا جاتا اور ایسی بری حالت سے ان کی جان نکلتی جس کے خیال کرنے سے کلیجہ تھرا اٹھتا ہے اور دل پھٹنے لگتا ہے۔ ریویو آف ریویوز کی پندرھویں جلد(۱) [illegible] اور ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سنگ دل مردوں نے عورتوں کو کس طرح سے قبلہ مصیبت میں ڈالا ہے۔

ان [illegible] انقلابات کو دیکھنے والا مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ حیرت زدہ ہو کر اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ یہی عورتیں ابھی کل کی بات ہے کہ پوری آزادی سے بہرہ ور اور مردوں پر حکمرانی کرتی تھیں۔ آج ان کی یہ حالت کیونکر ہو گئی کہ وہ بے رحمانہ انسانی مظالم کی شکار ہو رہی ہیں۔ کون

مظالم؟ جن کے تصوّر سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جو حد درجہ کے وحشیانہ ہونے کی حیثیت سے انسانی افعال قیاس نہیں کیے جا سکتے۔ آخر یہ حیرت خیز کایا پلٹ کیونکر ہوئی؟ اور اس تبدیلی کے پیدا ہونے کی وجہ کیا ہے؟ وہ کیا چیز تھی جس نے عورت کی سابقہ آزادی کو نابود کر کے اس کی جگہ اسے اتنی اسیری اور عبودیت اور اس قسم کے وحشیانہ برتاؤ میں مبتلا کر دیا۔ یہ تمام سوالات تاریخ کے مطالعہ کرنے والوں کے دل میں پیدا ہوں گے۔ اور وہ ان کے جوابات اس وقت تک نہیں پا سکیں گے جب تک کہ علم النفس اور علم العمران کے اصولوں کی چھان بین نہ کریں جو ایک لمبی چوڑی بحث ہے لیکن ہم اس کا ماحصل صرف دو[۲] باتوں میں بیان کرتے ہیں۔

جس وقت رومانیوں کی حکومت و سلطنت خوب عروج پر آگئی وہ عزّت و عظمت کے ساتھ دنیا کے سابق قوموں پر غالب آگئے۔ اور روئے زمین پر کوئی ایسا شخص نہیں رہ گیا جو ان کے سامنے چون وچرا کہہ سکے تو ان کے دلوں میں عیش پسندی اور راحت طلبی کی محبت نے گھر بنایا۔ اور یہ دونوں باتیں اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی ہیں، جب تک اس میں مرد اور عورت دونوں جنسوں کا باہمی میل جول نہ ہو اہل روما کی طبیعتوں میں یونان کے بے دینوں اور خود ان رومانی حکیموں کی تعلیم موثر ہو چکی تھی جو یونانیوں کے مقلد تھے۔ اسی لیے انہوں نے اپنی عورتوں کو پردہ سے آزاد کرانا شروع کیا۔ اور یہ حالت بڑھتے بڑھتے اس درجہ تک پہنچ گئی کہ آخر کار سیاسی معاملات میں بھی عورتوں کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ مرد و عورت کے اس آزادانہ میل جول کی وجہ سے روما والوں میں جیسی کمینہ عادتیں اور گندہ خصلتیں پیدا ہو گئی تھیں، میرا قلم ان کے کہنے سے شرماتا ہے۔ جن سے ان کی ہمتیں مردہ ہو گئیں اور ارادے پست ہو گئے۔ ور طبیعتوں میں کمینہ پن آگیا۔ پھر تو ان میں باہمی جنگ اور خونریزی وخانہ جنگی کا زور ہوا۔ اور یہ فساد اس قدر بڑھا کہ انسانیت اور اخلاق کا ان میں نام تک نہیں رہ گیا۔ اس حالت کے اثناء میں بہت سی نئی باتیں ایسی بھی پیش آئیں جنہوں نے خیالات کا رُخ پلٹ دیا۔ اور لوگوں کے دلوں میں خیال جما دیا کہ ان تمام خرابیوں کی جڑ محض عورتیں ہیں۔ اس لیے عورتوں سے ناراضگی بڑھنے لگی۔ ان پر دن بدن سختیاں کی جانے لگیں حتیٰ کہ معاملہ بڑھتے بڑھتے اس درجہ تک پہنچ گیا جسے میں قرونِ وسطیٰ سے لے کر سترھویں صدی کے خاتمہ بلکہ اٹھارھویں صدی کے آغاز تک کی حالت دکھاتے ہوئے تحریر کر آیا ہوں۔ اور مجھے نظر آتا ہے کہ مغربی ممالک (یورپ) کے لوگ آج پھر بعینہٖ وہی حالت ازسرِ نو قائم کرنا

چاہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہر روز عورتوں کے مفتون بنانے کے لیے نئے نئے اسباب اور خود اُن پر فریفتہ ہونے کے تازہ بتازہ ڈھنگ ایجاد و اختراع کرتے رہتے ہیں۔ اور ان کی پاک دامنی اور طہارت پر حملے کرنے کے واسطے طرح طرح کے وسائل استعمال میں لاکر اس کی تدبیر کر رہے ہیں کہ جس مصیبت میں عورتوں کی اگلی نسلیں مبتلا ہو چکی ہیں ویسی ہی آفت میں موجودہ عورتوں کو مبتلا کریں۔ یورپ کے تمام عقلمند اور فلاسفر لوگ اس بات کو بخوبی سمجھ گئے ہیں اور اب یہ بات ان کے نزدیک اتنی واضح ہو گئی ہے کہ انسائیکلوپیڈیا میں لکھی گئی۔ جیساکہ اس سے پہلے بہت سے مقاموں پر وہ عبارتیں نقل کی گئی ہیں۔ اور آگے چل کر اس سے بھی زیادہ اہم امور معلوم ہوں گے لہٰذا جبکہ بیچاری عورت مرد کے ہاتھوں میں گلبازی کی حیثیت سے زیادہ مرتبہ نہیں رکھتی اور جبکہ مرد اپنے دینداری کے زمانہ میں اس کو پردہ کی قید میں رکھتا ہے پھر جس وقت اس کے دل میں عیش پرستی اور لہو و لعب کی محبت داخل ہوتی ہے تو عورت کو پردہ سے نکال کر اس کی کمزوری سے دل بہلانا اور انواع و اقسام کی زیب و زینت اور بناؤ سنگار کے سامان ایجاد کرکے عورت کو عشرت پسند اور بداخلاق بنا دیتے کے بعد آخر اسے اپنے لیے ایک بارگراں پاکر دوبارہ پہلے سے بھی زیادہ سخت اور مصیبت ناک قید میں ڈال دیا کرتا ہے۔ تو ایسی حالت میں مسلمان خاتون کا پردہ میں رہنا اس کے لیے اس طرح کی مصیبت میں مبتلا ہونے سے بچنے کا بہت عمدہ ذریعہ ہے اور اس کے مرتبہ کمال کا محافظ۔ اسلام نے عورت کو اپنے حکیمانہ قوانین کے مضبوط و مستحکم احاطہ میں پناہ دی ہے۔ کون قوانین جو مسلمانوں کے دلنشین ہو کر ان کے صفحۂ قلب پر نقش فی الحجر ہو رہے ہیں۔ اور جب تک وہ اپنا دین بدل کر کسی اور مذہب کے پابند نہ ہو جائیں۔ ہرگز اس متین اور پائیدار چار دیواری کو منہدم نہیں کر سکتے کیا تم نہیں دیکھتے کہ مسلمان خاتون تیرہ سو سال سے ان تمام انقلابات کی۔ دسے محفوظ رہتی چلی آئی ہے جو اس کے سوا دنیا کی اور عورتوں پر طاری ہوئے۔ اور جس کا ایک شمہ تم کو دکھایا بھی جا چکا اس لیے تمہیں بتاؤ کہ پردہ سے بڑھ کر اور کون ایسی مبارک نعمت ہے جو عورت کو مرد کے ہاتھوں میں گلبازی یا کھلونا بنانے سے محفوظ رکھے ؟ تاکہ عورت مرد کی نفسانی خواہشوں کا شکار اور اس کے اشاروں کی تابع ہونے سے بچ سکے ؟ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یورپین عورتیں جس قسم کی سنگ دلی اور بے رحمی کی مسلسل کئی صدیوں تک مار کھاتی رہیں ان باتوں سے مسلمان خاتون کو پردہ کے سوا کسی اور چیز نے بچائے رکھا؟ ہرگز نہیں۔ پھر کیا وجہ کہ ہم ایسی عمدہ نعمت کو ترک کرنے پر آمادہ ہوں ؟

کتاب المرأۃ الجدیدہ کے مؤلف فرماتے ہیں کہ:۔

یورپ میں اس وقت بہت سی جماعتیں اس قسم کی ہیں جو حکومت سے سخت تزین مطالب بزور منوانے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ان میں سے کسی جماعت نے آج تک عورتوں کے پردہ میں رکھنے کا مطالبہ نہیں کیا۔ کیونکہ وہاں تو اس کے برعکس حالت ہے۔ کیونکہ مذہبی گروہ باوجود عورتوں کی آزادی اور ان کے حقوق میں اتنی افزائش سے ناراض ہونے کے جو عورتوں کو مردوں کے ساتھ ہم مرتبہ بنا دے اس بارہ میں معتدل المشرب اور متوسط خیال رکھنے والے اشخاص ہی کا ہم آہنگ ہے۔ اس لیے ہمیں سوال کرنے کا حق ہے کہ اس اتفاق کا راز اور سبب کیا ہے؟

ہم کہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ کے فلسفہ کا موسس "آگسٹ کونٹ" اور تمام فلاسفہ وقت جو فلسفہ حسی کے زبردست عالم اور یورپ کے ان بڑے لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جن کی رائے حقائق اشیاء پر حکم لگانے کے بارہ میں سارے ملک کے نزدیک مسلم ہوتی ہے۔ ان سب لوگوں کی رائے ہے کہ عورت کو صرف اس نمائشی آزادی ہی کا ضرورت سے زیادہ حصہ نہیں مل گیا ہے۔ بلکہ وہ اپنی طبعی حدود سے بھی خارج ہو گئی ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کے اقوال پچھلے بابوں میں ہم نقل کر چکے ہیں۔ اور وہ اقوال ہمارے اس دعوے کو بخوبی ثابت کر کے فاضل مؤلف کے قول کی تردید کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اس زمانہ کے نامی عالموں اور قلمندوں کے ایسے ہی اقوال موجود ہونے کے علاوہ سب سے زیادہ قابلِ اعتبار "انسائیکلوپیڈیا" کا فیصلہ ہے۔ جو علوم عصریہ کا نچوڑ اور عقلائے یورپ کی رایوں کا خلاصہ ہے۔ چنانچہ "انسائیکلوپیڈیا" کا مصنف عورتوں کے فتنہ میں پڑنے کی وجہ سے مملکتِ روما کی تباہی کا حال لکھنے کے بعد نہایت دردانگیز الفاظ میں یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ:۔

ہماری موجودہ سوسائٹی میں بھی جس میں عورتوں کو حد سے زیادہ گزری ہوئی آزادی ملی ہے، نظر آرہا ہے کہ عورت کے مذاق کی کمینگی اور اس کی وہ شدید خواہش جو اسے ہمیشہ اپنی آراستگی اور افزائش حسن و جمال کی فکروں میں مصروف رکھتی ہے۔ آخر اس حالت سے بھی کئی درجہ بڑھ کر آفت زار اور ہولناک ثابت ہو گی جو ہم سے پہلے روما والوں پر گزر چکی ہے ایک ایشیائی آدمی اس جملہ کو سُن کر چونک پڑے گا۔ کیونکہ یہ اسکے وہم وگمان

سے بالکل خلاف ہے۔ مگر وہ بیچارہ معذور رکھنے کے قابل ہے کیونکہ اسے ایک مدت
سے یورپ کی مادی مدنیت کی ہر ایک شکل کے ساتھ حسنِ ظن رکھنے کی عادت پڑ چکی ہے
اس کے دل میں یہ وہم سما گیا ہے کہ اس مدنیت کا راز سمجھ سکنا ایشیائی لوگوں کے دماغ کا
کام نہیں۔ ان کے پست خیالات تمدنِ یورپ کے بلند کنگروں تک پہنچ سکتے۔ اور اس
لیے ایشیا والوں کو یورپین مدنیت پر نکتہ چینی کرنے کا کوئی حق نہیں۔

انسائیکلوپیڈیا کا مصنف بہت کچھ حالات بیان کرنے کے بعد پھر لکھتا ہے:۔

بیشک کچھ ہم میں وہ پہلے شخص نہیں ہیں جن کو عورتوں کی زینت پسندی کا روز بروز ہمارے
اخلاق پر برُا اثر ڈالنا محسوس ہوا ہے بلکہ ہمارے نامور اہلِ قلم اصحاب نے بھی اس موضوع
پر خامہ فرسائی میں کمی نہیں کی۔ اور ہمارے بکثرت ناول جو عام پسندیدگی کی نظر دں
سے دیکھے گئے ہیں۔ اس خیال کو موثر پیرایہ میں ذکر کر چکے ہیں۔ جو عورتوں کے
حدِ جنون تک پہنچی ہوئی بناؤ سنگار کی خواہش سے گھرانوں کی بربادی کا سبب بن جاتی ہے
اس لیے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بیماری سے ہمارا پیچھا کیونکر چھوٹ سکے گا۔ جو
ہماری موجودہ مدنیت کی جڑیں کھود ے ڈالتی ہے اور اس کو بہت جلد معدوم و برباد
کر دینے کی دھمکی دے رہی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ دو کہ یہ ایک لاعلاج تنزل ہے۔

پھر اگر یورپ باوجود اپنی اس قدر شوکت و عظمت اور قوت و طاقت اور کثرتِ اسباب معاش و دولت
مندی کے اپنی انسائیکلوپیڈیا اور اپنے نامور اہلِ قلم کی زبان سے عورتوں کی فضول خرچی اور حد سے
بڑھ کر آرائش کو بربادی اور تباہی کا موجب بنا کر ایسی مدنیت کو باعثِ زوال قرار دیتا ہے۔ تو خیال
کرنے کی بات ہے کہ ایشیائی ممالک جو پہلے ہی افلاس تباہی کے غار میں گرے ہوئے ہیں ؛ عورتوں کے
لیے بناؤ سنگار کے افراط کا سامان کر کے کس مصیبت میں گرفتار ہوں گے ؛ ناظرین آپ نے دیکھا ہوگا
کہ میں عورتوں کیلئے باعتبار پاک دامن و عفت پسند رہنے کے پردہ کی ضرورت پر زور نہیں دیتا اور
اس غرض سے ان کو پردہ میں رکھنا نہیں چاہتا۔ مگر میرے ایسا نہ کرنے کی ایک وجہ ہے۔ اور وہ یہ
ہے کہ اس طرح پر عورت کی نازک جنس کے حقوق پامال ہوتے ہیں کون نازک جنس ؛ جس کے خیالات
اعلیٰ درجہ کے اور جس کے طبیعی جوش حد سے بڑھ کر قابلِ قدر ہیں۔ جو شرم و حیا کی پتلی اور نیکی اور طہارت

کی دیوی ہے۔ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ اخلاقی قوت اور وہ اخلاقی قوت جو انسان کی سرشت میں داخل ہے مردوں کی نسبت عورت میں بہت بڑھی ہوئی اور نہایت قیمتی ہے۔ عورتوں کی آبرو مردوں کی آبرو سے بہت ظاہر ہے اس واسطے میں پردہ کو ایک ایسا مستحکم قلعہ سمجھتا ہوں جس کے اندر پناہ لے کر وہ مردوں کے شرمناک حملوں سے محفوظ رہ سکتی ہیں اور اس حملہ آور جنس کی شرارت ان کو ضرر نہیں پہنچا سکتی۔ مردوں کو اس بات پر اعتماد ہوتا ہے ان کی جسمانی ترکیب میں کوئی ایسی بات نہیں، پائی جاتی جو ان کو بدچلن ہونے کی حالت میں یقیناً بدنام بھی کر سکے۔ ایک مرد بظاہر نیک بن کر اندرونی طور سے نخفیہ بدچلنی کر سکتا ہے اور اس کا پردہ بھی ڈھکا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے دیکھا جاتا ہے کہ بیباک مرد بڑی بڑی کوششوں اور عجیب وغریب ترکیبوں سے عورتوں کو اپنی جانب مائل کر لیتے ہیں۔ حوادث عالم کی چھان بین کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ عورت کو بدچلن بنانے اور اس کی اخلاقی طہارت کو نجس کرنے والا صرف مرد ہے، یہاں تک کہ مصری اخبار مقطم نے اپنی ۸، فروری ۱۹۰۱ء کی اشاعت میں عمرانی لحاظ سے پردہ کو بڑی رسم بتاتے ہوئے اس واضح اور عیاں حقیقت کو بھی پیش کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:۔

ہر ایک معاشرت، اور سوسائٹی کی تاریخ اس بات پر گواہی دیتی ہے کہ عفت و پاک دامنی کی اعلیٰ صفت پر مرد ہی حملہ آور ہوتا ہے اور عورت مدافعت کرتی ہے۔

لہٰذا اس صورت میں کیا یہ بات قرینِ انصاف ہوگی کہ ہم کوئی ایسا ذریعہ تلاش کریں جس کی اعانت سے کمزور اور نزاکت مآب عورت کو سنگ دل اور بدچلن مرد کی شرارت سے بچا سکیں؟ کیا یہ کوئی انصاف ہے کہ ہم عورت کو بے حیا مرد کی چالبازیوں کے چنگل سے بچانے کی تو کچھ بھی تدبیر نہ کریں مگر عورت کو (اگر خدانخواستہ ایسا واقع ہو تو) بدچلنی کا الزام دینے کے لیے تیار رہیں؟ جس وقت ہم عورت کو بدچلن ہونے کے لحاظ سے بُرا بھلا کہنے پر آمادہ ہوتے ہیں تو یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ کمزور مخلوق مرد کے شیطانی حیلوں اور مکریوں کے جال سے کیونکر بچ سکتی تھی، جبکہ خونخوار شیر باوجود جنگلوں میں زندگی بسر کرنے اور اژدہے باوجود تاریک غاروں اور تنگ بلوں میں رہنے کے اس کے دم مکر میں پھنس جاتے ہیں۔

ہمارا سوال ہے کہ لوگ عورت کو کس طرح کی مخلوق دیکھنا چاہتے ہیں؟ کیا ان کے خیال میں عورت اپنی نفسانی خواہشوں کے دبانے میں فرشتہ بن جائے؟ یا اپنے فطری جذبات کو مٹا دینے میں

بے حس جمادات کی مشابہ بن جائے ؟ اگر یہ خیال ہے تو نہایت افسوس کا مقام ہے۔ کیا یہ باتیں حد درجہ کی سنگدلی پر نہیں دلالت کرتیں ؟ کیا یہ سخت سے سخت قسم کی قید نہیں ؟ بعض لوگ کہیں گے کہ پھر تم مردوں کو پردہ میں بیٹھنے کا حکم کیوں نہیں دیتے عورتوں ہی پر اس قدر سختی روا رکھی کہ وہ بے چاریاں گھروں کی چار دیواری میں قید کر دی جائیں کیوں روا رکھی ہے ؟ کیا یہ پردہ کی قید عورتوں کی حق تلفی کیے جانے کی پیش بندی نہیں ؟ ہم اس کا یہ جواب دیں گے کہ جب عورتوں کا مردوں سے الگ رکھا جانا ضروری اور لابدی امر ہے۔ اور عورتوں کا وظیفہ طبیعی منزلی زندگی تک محدود ہونے سے ان کا گھر سے باہر نکل کر خارجی کاموں میں مشغول ہونا ایک سخت معاشرتی خلل ہے۔ تو اس بات پر لحاظ کرتے ہوئے مرد کی زندگی کا مقصد خارجی دنیا کے جھگڑوں پر پڑنا قرار پایا ہے۔ ہم کو لازم ہے کہ ان نقصانوں میں سے جو نقصان کم درجہ کا ہو اسے اختیار کر لیں اور زیادہ مضرت رساں بات کو ترک کر دیں۔ ورنہ اگر کوئی دانا اور فاضل شخص مردوں کے واسطے کسی ایسی تدبیر کو ایجاد کرے جس پر کاربند ہونے سے وہ عورت پر حملہ آور نہ ہو سکیں تو مجھے امید بلکہ یقین ہے کہ عورت کی نازک جنس کو آفاتِ زمانہ سے محفوظ رکھنے کے لیے مسلمان لوگ اس تدبیر پر سب سے پہلے بدل و جان عمل کریں گے۔ اخبار "المقطم" لکھتا ہے۔

> پاک دامنی کا تحفظ کرنے کے لیے سوسائٹی میں پردہ کوئی اعلیٰ درجہ کی چیز نہیں ثابت ہوتی اور ہمارے اس دعوے کی صحت پر یہ بات شاہد ہے کہ نامی نامی اہل قلم اور مصنفین میں ہم کو ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جو اس بات کا دعویٰ کر سکے کہ شہر کی پردہ نشین لڑکیاں بے پردہ پھرنے والی دیہاتی اور بدوی لڑکیوں کی نسبت زیادہ صاحبِ عفت اور پاک دامن ہوتی ہیں اور ایک کسان عورت یا بدوی عورت کی آبرو پردہ نشین بی بی کی طرح محفوظ نہیں رہتی۔

ہم بھی کہتے ہیں کہ اس بات کو ہر شخص صحیح تسلیم کرے گا۔ مگر اسی کے ساتھ ہمیں یہ بات بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ ایک کسان عورت اور ایک بدوی عورت جو بلا پردہ و نقاب رہتی ہیں وہ کسبِ معاش کی جنگ میں اور دنیا کے زندہ رہنے کے جھگڑوں کی ادنیٰ ترین حالت میں ہیں۔ اور سائیکولوجی (علم النفس) نے ثابت کر دکھایا ہے کہ جو انسان ایسی حالت میں ہوتا ہے اسے محض اپنی جان اور جسم کو ہلاکت سے بچانے کی فکر رہا کرتی ہے بنا بریں ایسی عورتوں کے پاس کوئی اس قسم کا وقت ہی نہیں بچتا جس میں ان پر

تکمیل اور تفریح کے خیالات غالب آکر انہیں ان کے نفسانی جذبات سے اثر پذیر ہونے پر مجبور بنا دیں۔ تم ان کو دیکھو گے کہ وہ اپنے شوہروں یا ماں باپ کے ساتھ سارا دن سخت جسمانی محنت کے کاموں میں بسر کرتی ہیں اور جس وقت رات آجاتی ہے تو ان کے تھکے ماندے بدن ان کو آرام حاصل کرنے کا خواہاں بنا دیتے ہیں۔ اس لیے تم دیکھو گے کہ کسان یا بدوی عورت کو جہاں اتنا مال مل گیا ہو اسے بسر اوقات کی فکر سے نجات دلا دے، پس وہ سب سے پہلے اپنا منہ چھپانے اور مردوں کی نظر سے اوجھل ہو جانے کی تدبیر کرے گی۔ اب رہا المقطم کا یہ قول کہ جس وقت اخلاقی بندش ٹوٹ جانے کی صورت میں پاک دامنی کے اعلیٰ جوہر پر حملہ آور ہونے والا عنصر مرد ہی ہوتا ہے۔ اور عورت اس بیش بہا جوہر کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں تو عقل کا تقاضا یہ ہے کہ عورت کی عقلی قوتوں کے ساتھ ہی اس کی اخلاقی قوتوں کو پختہ بنایا جائے۔ اس کے ادراک اور تجربہ کو وسیع کیا جائے تاکہ وہ اس بات کو بخوبی معلوم کرے کہ اسے اپنی فضیلت و کمال کے مرتبہ کو کس طرح محفوظ رکھنا چاہیئے۔ ہمارے پاس اس کا یہ جواب ہے کہ اس طرح کی تربیت ہر ایک عورت کو حاصل ہونا محال ہے بلکہ اس سے نفع اٹھا سکنا صرف دولت مند اور صاحبِ ثروت لوگوں کی بیٹیوں کا حصّہ ہے کیونکہ سالہا سال مدرسوں میں تعلیم پاتے رہنے کا اتنا خرچ پڑتا ہے کہ لڑکی کے برابر سونا تول کر ایسی تربیت دی جا سکتی ہے۔ اس وجہ سے ۹۹ فی صدی سے بھی زیادہ لڑکیاں اس قسم کی تعلیم و تربیت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتیں اور وہ حملہ آور عنصر (مرد) کے دام فریب میں بخوبی پھنس سکتی ہیں۔ لہٰذا اس خیالی تربیت کی بنیاد پر کوئی عام تمدنی یا معاشرتی قاعدہ کلیہ بنانا درست نہیں ہو سکتا۔ اور اسی کے ساتھ فیشن کے دلدادہ اور مددگار حضرات جس معنوی پردہ کو عورت کے لیے پیش کرتے ہیں یہ بہ نسبت ملک مادی پردے کے کئی درجہ بڑھا ہوا سخت اور دشوار ہے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ مرد عورتوں پر کس قدر سختی روا رکھتا ہے، ایک طرف تو یہ بات مانی جاتی ہے کہ عورت کی نازک جنس عنصرِ قوی کے دباؤ میں واقع ہوئی ہے۔ اور اسی کے ساتھ دوسری طرف یہ بھی خواہش کی جاتی ہے کہ عورت ایک مادی رکاوٹ کے ذریعے سے بھی جو مرد کو اپنی حد پر روک دے گی۔ اس سے اپنا چہرہ نہ چھپائے بلکہ یہ پردہ جو مرد اور عورت کے مابین ہونا چاہیئے صرف آنکھ کا اور اخلاق پردہ ہے۔ یعنی اس قسم کا پردہ جیسا فلاسفہ اور حکیم لوگ دنیائے فانی کو

محبت کے لیے قرار دیتے ہیں اور جو ان کے اور ان کی نفسانی خواہشوں کے مابین حائل ہوتا ہے سبحان اللہ!
گویا ہمارے مہربانوں کا یہ مقصد ہے کہ عورت کیا ہو ایک فرشتہ ہو جائے۔ جو باوجود اس کے
کہ اس پہ ہر طرف سے نفسانی خواہشوں کو بھڑکانے والے احساسات کا دباؤ ڈالا جاتا ہو کبھی بشریت
کے پھندے ہی میں نہ پھنسے۔

اثرِ تربیت

کیوں نہ ہو ہمارے بہ موجب عورت کو اس کا مادی پردہ عطا کر دیں تاکہ خود عورت اور اس کے ساتھ ہی مرد بھی، دونوں اس ہولناک کشمکش سے بچ جائیں، اور عورت کا وہ وقت خالی چھوڑ دیں جس میں وہ اس رنج والم سے بھری ہوئی زندگی کے میدان میں ظالم مرد کو نیچا دکھانے کی کوشش کرے؟ ہاں اس موقع پر کہا جائے گا کہ تم اس بحث میں اعتدال کی حد سے بڑھ گئے۔ تم نے افراط سے کام لیا اور جو کچھ تم نے ثابت کیا ہے اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ مرد کے لیے بجز اس کے دنیا میں اور کوئی ضروری کام ہی نہیں رہ گیا کہ وہ عورتوں کو ورغلاتا رہے اور ہر وقت ان کو اپنے دامِ فریب میں لانے کے درپے ہو جائے حالانکہ تربیت ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو عالی منشی، بلند حوصلگی اور شرافت و اخلاق کے فاخرہ باسوں سے ملبوس بنا دیتی ہے۔

مگر ہم اس کا یہ جواب دیں گے کہ یہ سب باتیں کہنے اور سننے کے لیے ہیں ورنہ ہم کو تو زمین کے کسی خطہ میں ان الفاظ کے مدلولات اور معانی دکھائی نہیں دیتے۔ اگر یہ بات صحیح ہوتی کہ تربیت و تہذیب انسان کی تعدی و زیادتی کو مٹانے میں مادی سزاؤں کی قائم مقام بن جاتی ہے تو پھر معتدل فرقہ کے تمام نظریات کو بھی صحیح ہونا چاہیئے کیونکہ وہ بھی تو یہی کہتے ہیں کہ یہ مروجہ قانون اور قانونی لوگ جن کی تعظیم و عزت کی جاتی ہے اور یہ حکومت جو انسانوں کی مقداروں پر غلبہ رکھتی ہے، اور انہیں اپنے اپنے اندازہ پر قائم کیا کرتی ہے، یہ سب باتیں محض ایسی رکاوٹیں ہیں جو انسان کو ظاہری اور باطنی کمال کے مدارج پر ترقی کرنے سے باز رکھتی ہیں۔ ورنہ اگر انسان یوں مخلّی بالطبع چھوڑ دیا جائے کہ اس کی فطری قوتیں ہی اس پر تاثیر ڈالتی رہیں تو اس میں بذاتِ خاص اعلیٰ درجے کے جذبات نشو و نما پائیں گے۔ اور دنیا میں

پھیلے ہوئے طبعی قوائے فاعلیہ کے اثر سے انسان کے اخلاق خود بخود سدھرتے جائیں گے بغیر منفذوں کا یہ قول ہے کہ یہ قوانین جن کی نسبت لوگوں کا خیال ہے کہ ان سے ملکوں میں عدل و انصاف قائم ہوتا ہے انسانوں کے حقوق مساوی کیے جاتے ہیں۔ ظالموں کو ظلم و زیادتی سے روکا جاتا ہے اور بدچلن لوگوں کو انصاف اور دادخواہی کے دائرہ سے قدم باہر نہیں رکھنے دیا جاتا۔ ان قوانین کا بجز اس کے اور کوئی اثر نہیں دیکھا جاتا کہ ان سے مجرم لوگوں کی تعداد بڑھتی ہے اور دنیا میں سنگ دلی اور بداخلاقی زیادہ پھیلتی جاتی ہے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ اگر فی الواقع تربیت مادی سزاؤں کی بجائے انسانی عادتوں کو سنوار سکتی ہے تو یہ بھی صحیح ہے کہ کسی نظری قضیہ کی تحقیق کرتے ہوئے خارجی مقدمات سے مدد لینے کی ضرورت نہیں۔ بس اسی قضیہ پر استناد کر لینا کافی ہے جس کی تحقیقات جاری ہو۔

میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ کوئی صاحب مجھے دنیا کی تمام قوموں میں سے ایک قوم بھی ایسی دکھا دیں جس میں محض تربیت کے فیض نے اس سنگ دل مرد کو اپنی بہیمی خواہشوں سے روک دیا ہو اور اس کے حیوانی اغراض کو اس سے ترک کرا دیا ہو؟ دنیا کی تاریخ ہمارے پیش نظر ہے۔ اور یہ تمام قومیں اور مذاہب ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔ مگر وہ سب اس بات کی ناطق دلیل بن کر شہادت پیش کر رہے ہیں کہ محض تربیت ہی نے ایک دن بھی مرد کو برائیوں میں مبتلا ہونے اور جرائم کا ارتکاب کرنے سے باز نہیں رکھا اور اس کے فولادی دل کو کبھی اس لیے نرم نہیں بنایا کہ وہ کمینہ عادتوں پر عمدہ عادتوں کو ترجیح دے۔ کاش اگر ہم بھی ان لوگوں میں سے ہوتے جو خیالی پلاؤ پکا کر اپنا دل ٹھنڈا کر لیتے ہیں، تو صرف تربیت کے فوائد پر ہم اس سے کہیں زیادہ حاشیے چڑھا سکتے تھے۔ جتنے اور لوگ چڑھاتے ہیں، مگر ہم تو تجربات زندگی کے دائرہ سے باہر قدم رکھنا نہیں چاہتے۔ اور جب تک ہم تک ٹھیک ٹھیک بات کہنے کے آرزومند ہیں۔ اور ممکن الحصول ترکیبوں کو بتانا چاہتے ہیں۔ اس وقت تک ہمارا یہی مسلک رہے گا۔

اس مقام پر اس بات کی ایک اور محسوس مثال پیش کرتے ہیں جس سے واضح ہو جائے گا کہ انسان کی خواہشوں کو قانونی سزاؤں سے آزاد اور اس کے جذبات کی روک تھام و بند سے بری کر دیا جائے تو صرف تربیت ہی ہرگز اس کی مطلوبہ درستی حالت کے لیے کافی نہ ہوگی۔ دیکھو متمدن ملکوں میں ایک شخص بچپن سے لے کر جوانی اور بڑھاپے کی عمر تک برابر شراب خواری سے روکا جاتا ہے۔

اخبارات، رسائل، کتابوں اور لیکچروں کی زبانوں سے وہ شراب کی خرابیاں سنتا اور مطالعہ کیا کرتا ہے۔
یہاں تک کہ اس عادتِ بد کی بدولت پڑے سڑنے والے شخصوں کی حالت اپنی آنکھوں سے دیکھ کر محسوس
کرتا ہے کہ فقر و فاقہ اور مرض اس کے لوازم ہیں۔ وہ بخوبی دیکھتا ہے کہ شراب خواری نے اس کے
علاوہ دوسرے اشخاص کے سنسناتے جسم کو اس طرح بگاڑ دیا ہے کہ جن کے دیکھنے سے عقل چکرا جاتی
ہے اور دل لرز جاتا ہے۔ مگر باوجود ان سب باتوں اور اتنی اعلیٰ تربیت حاصل کرنے کے خود وہی
شخص مے نوشی پر مٹا ہوا دیکھا جائے گا۔ اس نے شراب خواری پر اپنی زندگی وقف کر دی ہوگی۔ اور
روز بروز اس عادتِ بد میں ترقی اور کمال حاصل کر رہا ہوگا۔ اب بتاؤ کہ تربیت نے کیا عمل کیا اور تہذیب
نے کونسا اثر دکھایا؛ کیا یہ ایک ایسی محسوس دلیل نہیں ہے جس کو ہر ایک صاحب نظر شخص دیکھ سکتا
ہو۔ اور اس پر نتیجہ نکال سکتا ہو کہ یہ حملہ آور عنصر (مرد) صرف تربیت ہی کے وسیلہ سے اپنی حد پر نہیں
رُک سکتا۔ چاہے وہ کیسی ہی اعلیٰ درجہ کی ہو۔ مگر جبکہ تربیت کے ساتھ ہی کوئی مادی رکاوٹ بھی شامل
نہ کی جائے جو آدمی کو گندی باتوں میں آلودہ ہونے اور کمینہ عادتوں کی پیروی کرنے سے روک دے؛ اور
جبکہ محض شراب کا معاملہ ہے جس کے پینے آدمی کی جسمانی ترکیب میں کوئی مطالبہ کرنے والی قوت بھی
نہیں پائی جاتی دریافت کرنا چاہیئے کہ پھر مرد کی ان بہیمی خواہشوں کے روک تھام میں خالی تربیت کا کیا
خاک اثر ہوگا جو [illegible] جسمانی ساخت کے لحاظ سے بھی اسے اپنی راہ چلنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اس
بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ [illegible] کو قیدی بنانے یا اسے حقیر سمجھنے اور اس پر [illegible]
کی نیت سے پردہ نہیں بتایا بلکہ وہ اس پر غیرت کھانے اور اسے اس حملہ آور عنصر (مرد) کے
ہاتھوں سے محفوظ رکھنے کی غرض سے ایسا کرتا ہے۔ کیونکہ [illegible] اس بات پر روشنی ڈال رہا ہے
کہ عورت کو بہکانا مرد ہی کا کام ہے اور عورت اپنی [illegible] مردانہ وار اس کے حملوں سے [illegible]
والی ہے۔ مسلمان [illegible] اس [illegible] پردہ میں نہیں رکھتی کہ پردہ اس کے ذہنی [illegible] اور [illegible]
اخلاق پر [illegible] تربیت جا سکتی [illegible] ہے بلکہ اس کا یہ [illegible] ہے [illegible]
نہایت مناسب عزت، بڑی غیرت داری، اپنے نفس کی مدافعت میں [illegible]
دو قوتوں [illegible] ہتھیاروں سے کام لینے والی ہے۔ جن میں سے ایک تو اس کے اندرونی اخلاق [illegible] اور
دوسرا اس کا ظاہری پردہ تاکہ اس کے دامنِ عفت کو چھو سکنے سے بالکل مایوس ہو [illegible]

علم حاصل کر لینے کے بعد بھی کوئی مرد اپنی عورت کو پردہ توڑ دینے کی صلاح دے سکتا ہے یا خود وہ عورت اپنی مرضی سے پردہ کو اتار کر الگ رکھ سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔

جس طرح یورپ میں کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ سلطنت، حکومت اور قاعدہ و قانون انسان کی ابتدائی تاریک زندگی کے یادگار اصول ہیں۔ اسی طرح چند اشخاص پردہ کو بھی زمانہ جاہلیت کی باقی ماندہ رسم بتاتے ہیں مگر ہمارا یہ مقصد نہیں کہ معدودے چند لوگوں کے کسی بات کو اچھا یا برا سمجھنے کے لحاظ سے قابلِ عمل معاشرتی قانون بنائیں یا کوئی اصولی قاعدہ کلیہ قرار دیں کیونکہ دنیا کی قوموں میں آج بھی مختلف خیالات پائے جاتے ہیں کسی کو دانتوں کی سفید چمکیلی رنگت بُری معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ انہیں سیاہی سے رنگ دیتے ہیں کہیں زیب و زینت کے لیے نیل کا گدنا گدوایا جاتا ہے۔ تو کیا اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ ہر جگہ کے رہنے والے انہیں امور کو پسند کریں؟ نہیں بلکہ انسان کے اعمال کو عمدگی اور بہتری کے میزان پر تولنے کے لیے عقل و فطرت کو سب سے بڑھا ہوا پایہ نصیب ہے اور انہیں کے اعتبار سے جو حکم لگایا جائے وہ درست اتر سکتا ہے اس لیے ہمیں جب کبھی حالات یا انسانیت کے احوال کو جانچنا اور پرکھنا منظور ہو تو اس کے تولنے اور آزمانے کے لیے انہیں دونوں میزانوں اور معیاروں پر اعتماد کرنا مناسب ہے اور ہم شروع میں بیان کر آئے ہیں کہ انسانیت کے حالات ایک ایسے کالج کے مشابہ ہیں جس میں انسان کو ہر ایک مناسب و نامناسب کی تعلیم مل سکتی ہے اور اگر بعض آدمی پردہ کو بہ نظرِ نفرت دیکھ کر اسے گرفتاری تصور کرتے ہیں تو اسی کے بالمقابل پردہ کو اچھا سمجھنے والے اشخاص تمدن کی پابندی میں بن سنور کر عورتوں کا برانداختہ نقاب پھرنا کہیں زیادہ برا خیال کرتے ہیں۔ یہ واضح ہو جانے کے بعد کہ پردہ عزت اور غیرت مندی کی علامت اور عورت کے استقلال و سعادت کا واحد ضامن و کفیل ہے اب ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہ آیا پردہ عورت کے کمال تک پہنچ سکنے میں مانع ہے یا نہیں؟

پردہ اور عورتوں کا کمال

ہم مسلمان جن کو خُذ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدَرَ پر عمل کر کے فائدہ اور حکمت کی بات جہاں سے بھی مل سکے لے لینا چاہیئے۔ ہمارا فرض ہے کہ جب تک حرکتِ انسانی کے مکمل مجموعہ کو نہایت غور اور تحقیق کی نگاہوں سے نہ چھان ڈالیں اور فائدہ کے شگفتہ پھولوں اور نقصانوں کے نوک دار کانٹوں میں امتیاز نہ کر لیں اس وقت تک کسی معاملہ میں ہاتھ نہ ڈالیں تاکہ ہم مضرت رساں پہلوؤں سے بچ کر مفید و کار آمد چیزوں سے فائدہ اُٹھانے کے اہل ثابت ہوں۔ ہمارے پاک خدا نے ہمیں یہ ہدایت کی ہے کہ گزشتہ قوموں کی تاریخ پر غائر نگاہ ڈال کر اس بات کا مطالعہ کرو کہ ان کی بربادی و تباہی کے اسباب کیا ہوئے۔ پھر ان امور سے بچنے کی کوشش کرو تاکہ انہی قوموں کی طرح تم پر بھی آفت اور زوال نہ آ جائے اسی بنیاد پر ہم نے یہاں تمدنِ یورپ کے روشن اور تاریک پہلوؤں کو پوری طرح دکھایا۔ پھر ان کا گزشتہ اقوام کی حالت سے مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ عورتوں کو مطلق العنان بنا دینے سے علاوہ اس کے کہ ان پر طرح طرح کی ناقابلِ برداشت مصیبتیں نازل ہوں گی مردوں کو بھی ایسی آفت کا سامنا ہو گا کہ وہ موجودہ علمائے یورپ کی طرح چیخ اُٹھیں گے۔ اس لیے ہم پر واجب ہے کہ اس راستہ سے جو بربادی کے مہلک غار کی طرف جا رہا ہے الگ ہو کر عورتوں کی اصلاح اور درستی کے لیے کوئی ایسا صاف و سیدھا راستہ تلاش کریں جس پر چلنے میں ہمیں حکمتِ الٰہی کے حدود اور احکام فطرتِ انسانی کے دائرہ سے ذرا بھی قدم باہر رکھنا پڑے۔

افسوس ہے کہ ہمارے ملک کے وہ نوجوان جن کو آزادیٔ مستورات کے خبط نے گھیر رکھا ہے۔ بجائے اس کے کہ یورپ کی نیم آزادی یافتہ عورتوں کی حالت پر غور کر کے اسے ایک سوشل مرض تصور کریں اور ان یورپین علماء کے ہم خیال بنیں جن کی علمیت اور لیاقت دماغی زمانہ میں مسلم ہے۔ پھر انہیں

یورپین اور امریکن فاضلوں کی طرح اپنے ملک کو اس خرابی کی اشاعت سے محفوظ رکھنے کی سعی کریں۔ اسلئے وہ ان گمراہ خیال اور احمق یورپی فرقہ کی پیروی کرتے ہیں جس کو عقلائے یورپ نے بہت آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ چنانچہ آگے چل کر ہم انہیں فاضل لوگوں کے اقوال سے یہ بات ثابت کر دکھائیں گے۔ کاش! ہمارے وہ قومی نوجوان جو اپنی ترقی کا راز یورپ کی اندھی تقلید اور اس کے قدم بقدم چلنے میں مخفی خیال کرتے ہیں، اس خطرناک دروازہ کو کھٹکھٹانے کی جگہ تھوڑی دیر کے لیے ہماری اسلامی زندگی کے سوشل قواعد پر نظر ڈالتے تو انہیں صاف طور سے معلوم ہو جاتا کہ اسلام کی پاکیزہ روح نے اپنے صحت بخش اثرات ہمیں ان تمام تمدنی اور سیاسی خوفناک مرضوں سے محفوظ رہنے کی قوت عطا کر دی ہے۔ مگر ہم اس سے اسی وقت مستفید ہو سکتے ہیں جبکہ اس روح کو اپنے جسم میں داخل کریں۔ جناب قاسم بک اپنی کتاب "المرأة الجدیدہ" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

اس لیے ہم یقین کر سکتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بھی ہر سال بہ نسبت سالِ ماسبق کے پیشہ ور اور دستکار عورتوں کی تعداد بڑھتی جائے گی کیونکہ اب ہم بھی اس شاہراہ پر چل رہے ہیں، جس پر ہم سے پہلے یورپ کا ملک قدم زن ہوا تھا۔

ہم فاضل مؤلف سے اس بارے میں بالکل متفق نہیں ہو سکتے۔ نہ ہم یورپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں اور نہ کبھی اس کی خواہش ظاہر کی ہے اگر یونہی اہلِ یورپ کی اور ہماری معاشرت پر ایک سرسری نظر بھی ڈال کر دیکھا جائے تو ہمارے اصول زندگی اور اسبابِ تمدن میں ان کے اصولِ زندگی اور اغراضِ تمدن سے کوئی مناسبت ہی نہ پائی جائے گی۔ ہماری قومی بنائش کا ذریعہ دینی اصول ہیں، ہمارے دل میں یہ خیال جما ہوا ہے کہ ہم انہی سعادت دو جہان تک پہنچانے والے اصول کو ترک کر کے اپنے تختِ عزت سے اتار کر خاکِ ذلت پر پٹک دیئے گئے اور یورپ کی قوموں کے افراد ہم جنس اور ہم وطن ہونے کی رسیوں سے باہم بندھے ہیں۔ ان کے تمدن میں ان کی موجودہ ترقی کا راز دینی تعلیم سے الگ ہو کر کام کرنا ہے۔ اس لیے ہمارے عام اصولِ معاشرت پر سرسری نظر کرنا ہی اس بات کو مان لینے کے لیے کافی ہے کہ جب تک ہمارے یہاں بھی دینی رابطہ کی بجائے ملکی اور ہم جنسی کا رابطہ باعثِ اتحاد نہ قرار پا جائے اور جس وقت تک ہمارے ذہن میں یہ بات نہ جم جائے کہ ہم اسی وقت ترقی کر سکتے ہیں جبکہ اپنے دینِ اسلام سے (معاذ اللہ) دستبردار ہو جائیں۔ اس وقت تک ہم کسی طرح یورپ کی تام بقدم پیروی نہیں کر سکتے۔ مگر اس موقع پر ہم یہ سوال کریں گے کہ آیا جب تک ہمارا

تجربہ ہم کو بتاتا ہے کہ ہمارا مذہب ہی ہمارے لیے اکسیر شفا اور ہمارے تمام زخموں کا مرہم ہے۔ اس وقت تک یہ کیسے ممکن ہے کہ مذکورہ بالا مہلک اور برباد کن تغیر ہم میں پیدا ہو سکیں۔ حضرت یہ ہمارا ہی عقیدہ نہیں بلکہ بہت سے یورپین علماء بھی اس مسئلہ میں ہمارے ہم خیال ہیں۔ اور انہیں بخوبی معلوم ہے کہ مسلمانوں کے تنزل کا سب سے بڑا سبب ان کی دینی لاپروائی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب تک ہمارا اعلیٰ رابطہ دنیائی اور قوموں کے رابطوں سے جداگانہ رہے گا۔ اور ان شاء اللہ رہے گا ہم مطلقاً کسی دوسری قوم کی ایسی اندھی تقلید نہیں کر سکتے جس سے ہماری طبیعی ترکیب کا یا پلٹ ہو جائے۔ اور جو ہمارے دلوں میں جڑ پکڑے ہوئے طرز تمدن سے مطابق نہ ہو۔ پھر اسی کے ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ عورتوں کے بارہ میں یورپ جس راستہ پر چل رہا ہے وہ اسی کے مستند علماء اور عمرانی حضرات کی شہادتوں سے نہایت پُر خطر اور آفت زا ثابت ہو رہا ہے۔ کیونکہ یورپ کے روشن خیال علماء عورتوں کو مردوں کے کام سنبھالنے کی کوشش میں مصروف پا کر اسے ایک ایسا معاشرتی مرض تصور کرتے ہیں جس کی روک تھام اور جس کا علاج ضروری ہے۔ پھر ہمیں ایسی کیا پڑی ہے کہ خواہ مخواہ نائی وہ بیماری اپنے گھروں تک لائیں اور انہیں آلام کے شکار بنائیں جن سے خود آج اہل یورپ بھی پیچ رہے ہیں؟ اور اگر ہمیں یورپ کی تقلید ہی کرنا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ان باتوں میں ان کی پیروی نہ کریں جن میں وہ راستی اور درستی کے مسلک پر چل رہے ہیں۔ بہر حال ہم کو اس وقت تک کوئی بات اختیار نہ کرنی چاہیئے جب تک اس کا کھوٹا کھرا پرکھ کر اور عقل مصلحت اندیش سے کام لے کر اس کے تمام نشیب و فراز کو سمجھ نہ لیں۔ محض ظاہری چمک دمک پر فریفتہ ہونا دانائی سے بہت دور ہے۔ پھر اگر ہم اپنے آپ میں اتنی ہمت نہ پائیں تو کم از کم آج جو کتابیں علمائے یورپ کی مصنفہ مل سکتی ہیں انہی کی ورق گردانی کر کے دیکھیں کہ وہ لوگ اس بارہ میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے جو باتیں مسئلہ نسواں کے متعلق کہیں انہیں نوٹ کر کے سوچ بچار کرنے کی زحمت گوارا کریں تاکہ مسلمانوں کو یہ تو معلوم ہو جائے کہ اگر ہم اپنی بیماریوں کا علاج خود اپنے ہاتھوں نہیں کر سکتے تو ہماری یہ کوشش بھی کہ اور قوموں کے ہاتھوں سے ان کا معالجہ کرائیں، بالکل عبث ہوگی۔

علامہ فوریہ کے قول کو سند اور دیکھو کہ باوجود آزادیٔ نسواں کا بہت بڑا حامی ہونے کے اس جنس لطیف کی پریشان روزگاری پر اشک حسرت بہاتا جاتا ہے اور کہتا ہے:

آج عورتوں کا حال کیا ہے! وہ محرومی اور بے کسی کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ کاروباری دنیا میں

بھی ہر طرف مردوں کا دور دورہ ہے۔ یہاں تک کہ سلائی اور کشیدہ کے باریک کام بھی مرد کے قابو میں دیکھے جاتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں عورت سخت محنت اور تھکا دینے والی مشقت کے کام میں مصروف پائی جاتی ہے۔ اب بتاؤ کہ مال و دولت سے بے نصیب بنائی گئی عورتوں کی زندگی بسر ہونے کے کون سے ذریعے رہ گئے؟ کیا وہی بہرخیا حسن وجمال بشرطیکہ وہ ہو بھی؟

کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہم کو اپنی تمام ضروریات زندگی اور اصول معاشرت میں بالکل یورپ کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے ان کی رائے میں ہماری ترقی کے لیے یہی صورت کارآمد ہے کہ ہم یورپ کے نقش قدم کا تتبع کریں۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ یورپ کا راستہ کچھ اور ہے اور ہمارا طریقہ کچھ اور۔ اور صاف صاف بات یہ ہے کہ ہمارے اسلامی معاشرت کے اسباب اور زندگی بسر کرنے کے اصول جنہوں نے آج تک ہم کو اقوام عالم کے جسموں میں مل کر اپنی ہستی فنا کرنے سے محفوظ رکھا اور ان شاء اللہ آئندہ بھی اس سے بچائے رکھیں گے ہمیں اس وقت تک یورپین لوگوں کے مثل بننے کا ہرگز موقع نہ دیں گے جب تک ہم اپنی قومیت کو مٹا کر ان کے مومی جسم میں فنا اور اس کے ایک جزو نہ ہو جائیں۔ اور یہ بات محال نظر آتی ہے کیونکہ اسلام کی قوی و پائیدار روح نے ہمیں اس قدر متانت عطا کی ہے کہ اب کوئی قوم یا ملت ہم کو پیس ڈالنا چاہے تو ہم پس نہیں سکتے بلکہ قبل اس کے کہ کوئی غیر ہم کو پیس ڈالے خود یہی متانت ہم کو ریزہ ریزہ کر دے گی۔

اس کی مثال یہ ہے کہ ذرا ان یورپ میں جا کر تعلیم پانے والے معدودے چند اشخاص کی حالت پر نظر ڈال کر دیکھو کہ ان کو وہاں کی مادی مدنیت کی نظر فریب نمائش نے کس طرح اپنا مفتون بنا لیا ہے یورپین طرز معاشرت کا افسون ان کے دلوں پر ایسا چل گیا ہے کہ اب وہ لباس، مکان، کلام، سلام اور ہر ایک طرز ادا میں اہلِ یورپ ہی کی تقلید پر مٹے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کو ایک نظر دیکھ کر ہمیں بتاؤ کہ ان کی کیا حالت ہو گئی ہے؛ اور اب تم انہیں کس جانب منسوب کر سکتے ہو؟ آیا وہ ایشیائی اور ایشیا کے باشندے ہیں؟ کبھی نہیں۔ کیوں وہ ایشیا اور ایشیائی باشندوں کو گالیاں دیتے ہیں۔ یہاں کی عادتوں اور رسم و رواج کو برا بتاتے ہیں اور ان کو ایشیائی ممالک میں بجز پستی اور ادبار کے کوئی اور بات نظر ہی نہیں آتی۔ وہ اپنے ملک میں جدھر منہ پھیرتے ہیں۔ ادھر کی حالت دیکھ کر بے ساختہ اُف کر دیتے ہیں اور جہاں نظر ڈالتے ہیں وہیں ان پر حسرت چھا جاتی ہے مگر پھر کیا وہ یورپین ہو گئے؟ ہرگز نہیں۔ اس لیے کہ ان کی صورتیں اس کے خلاف گواہی دیتی ہیں۔ اور ان کے قابلِ اعتنار اور جوہری اسمال کھلم کھلا اُن کے

منافی نظر آتے ہیں۔ گو وہ زبانی جمع خرچ سے اپنے آپ کو تعلیم یافتہ اور ترقی کردہ بتاتے ہوں لیکن فی الواقع وہ تعلیم پاکر اور کھوئے گئے۔ نہ ان میں جد وجہد کا مادہ ہے۔ نہ ہمت و استقلال ہے اور نہ ان کے پاس کوئی ایسی خوبی ہے جس سے ان کے اہلِ ملک کو نفع پہنچے یا جو خود ان کے ذمہ سے بارِ الزام کو ساقط کر سکے۔ یہ کیوں ہوا؟ اس واسطے کہ انہوں نے اہل یورپ کی تقلید کرنی چاہی مگر انہیں اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خود انکی طبیعتوں میں ایک ایسی قوی رکاوٹ موجود ہے جو انہیں اہلِ یورپ میں شامل ہونے سے باز رکھتی ہے تاہم وہ جس راستہ پہ قدم رکھ چکے تھے۔ اس سے واپسی اور اپنے قدیم دستور پر عمل کرنے کا موقع اس لیے نہیں پا سکتے کہ اہل یورپ کی چند ظاہری اور اوپری تقلیدیں جو انہوں نے اختیار کر لی تھیں۔ اب ان میں بطورِ ملکہ طبیعی کے جم گئی ہیں۔ لہٰذا وہ اہلِ نظر اور صاحبِ دل لوگوں کے سامنے بالکل اپنی جگہ پہ پس کر رہ گئے ہیں ؎

گئے دونوں جہاں کے کام سے وہ
نہ ادھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے

لیکن اس کے برعکس بلغاریہ، سرویا اور مانٹی نیگرو وغیرہ یورپین خطوں کے نوجوان جو اپنی تعلیمی زندگی پیرس و لندن وغیرہ کی عظیم الشان یونیورسٹیوں میں بسر کرتے ہیں۔ جب اپنے ملک کو واپس آتے ہیں تو ان کی قوم اور ان کے اہلِ ملک انہیں محلِ اعتبار اور قابلِ اعتماد قرار دیتے ہیں۔ اور وہ لوگ عالی حوصلگی اور بڑے بڑے کام انجام دینے کے لحاظ سے اس کے مستحق بھی ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے کہ بوجہ یورپین ہونے کے ان کے اور انہیں یورپین ملکوں کے اصولِ زندگانی یکساں ہیں۔ اور ان کے لیے وہی باتیں مفید ہیں جو وہاں سکھائی جاتی ہیں بخلاف اس کے مصر یا ہندوستان کے نوجوان جو یورپ میں تعلیم حاصل کرنے جائیں وہ ان قوموں کی مخرّبِ اخلاق و مشرقی تمدن و معاشرت کے برعکس عادتوں کو اپنا جزوِ معاشرت بنا کر واپس آتے ہیں اور بجائے اس کے کہ اپنی قوم [illegible] کی نگاہوں میں محبوب ہوں۔ ان کے معتمد علیہ بنیں اور انہیں فائدہ پہنچانے کی کوشش کریں۔ اُلٹے ملکی اور قومی سوسائٹی پہ بارِ گراں بن جاتے ہیں۔ اور اپنے ہم وطنوں کو حقیر و قابلِ نفرت سمجھتے ہیں۔

اب ہم پھر مسئلہ نسواں کی بحث پر واپس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس حالت میں ایک مسلمان اپنی بیوی اور لڑکی کو معمولی برادری کی تقریبوں میں بھی گھر سے باہر جانے کی ممانعت کرتا ہے (حالانکہ یہ پردہ کی نسبت بڑھی ہوئی سختی ہے) اور جہاں تک ہو سکتا ہے پردہ کی سخت تاکید رکھتا ہے۔ تو یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو ایسی تعلیم دے جو اُسے کسی دکان پہ مال بیچنے اور کسی کارخانہ میں کام کرنے کے قابل بنائے؟ جبکہ مسلمانوں میں

اپنی عورتوں کو غیر مردوں کی آواز سننے یا اسے اپنی آواز سنانے سے روکا جاتا ہے تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کو عام اخلاقی یا معاشرتی جلسوں یا سیاسی جلسوں میں لیکچر دینے کی قابلیت پیدا کرنے کی ترغیب دے؟ جہاں صدہا نامحرم اس کی گفتگو سنیں گے اور اس کو دیکھ سکیں گے، ایک صدی کے قریب زمانہ ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کو یورپین اقوام سے میل جول کا زیادہ اتفاق ہوا۔ اور یوں تو صدہا سال سے غیر قوموں کے ساتھ ان کا رہنا سہنا چلا آتا ہے۔ لیکن آج تک بجز اس کے کہ ان میں پردہ کی قید بڑھتی ہی گئی ہو کبھی اس کے توڑ دینے کا خیال بھی نہ آیا! تاہم جب یہ حکم لگا دیا جائے کہ ہماری ترقی کا انحصار صرف عورت کی آزادی پر ہے۔ اور ہم بغیر اس کے ترقی کر ہی نہیں سکتے تو یاد رکھو کہ ہم اس ترقی کے بلند زینہ پر پہنچنے سے پہلے ہی مٹ جائیں گے۔ اور کبھی مسلمان نہ رہیں گے اور خدا وہ دن نہ دکھلائے جبکہ ہم اسلام کے دائرہ سے باہر ہو جائیں۔

پھر بھی ناامید نہ ہونا چاہیئے کیونکہ اگر ہم لوگ اس بات کو متفقہ طور سے مان لیں کہ عورتوں کا مردوں کے کاروبار میں مصروف ہونا ایک سخت اجتماعی مرض ہے جو قوموں کی زندگی کا خاتمہ کر دیا کرتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہم بجائے اس کو پھیلانے اور بڑھانے کی جدوجہد کرنے کے مسلمانوں کی اس کراہٹ سے فائدہ نہ اٹھائیں جو وہ اس بارہ میں رکھتے ہیں۔ جبکہ ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ قوموں کی بربادی اور تباہی قوانین فطرت کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے تو عورتوں کی مردوں کے کاروبار میں شرکت بھی ضرور قوانین فطرت سے سرکشی ماننی چاہیئے جس پر تمام دنیا کے دانش مندوں کا اتفاق ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ ناموس ترقی ہر چیز کو زمانہ آئندہ میں پھر اپنی طبعی وضع پر لے آئے گا۔ مگر کب؟ جبکہ وہ اپنی مخالفت کرانے والوں کو سخت سزائیں بھی دے چکے گا۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ط

پردہ عورت کے کمال کا مانع ہے؟

انسان اپنی زندگی کے ہر دور میں ایسا ہی پایا جاتا ہے کہ اگر وہ کسی چیز کو پسند کرے تو اُس کی خوبی ثابت کرنے کے لیے ہزاروں دلیلیں پیش کر دینا اس کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ اور کوئی امر اسے ناپسند ہو تو اس کی قباحت ظاہر کرنے پر بھی ساری دنیا کی دلیلیں جمع کر دیتا ہے۔ اس لیے اگر دنیا کی حالت اور اس کے انقلابات حقیقی امور کے شاہد عادل نہ ہوتے تو اس میں شک نہیں تھا کہ اس عالم میں کوئی انسان حقائق کی کنہ تک کبھی نہ پہنچ سکتا۔ بلکہ مغالطات ہی کے چکر میں پھنسا رہتا۔ کَانَ الْاِنْسَانُ اَکْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا۔ انسان بڑا جھگڑالو ہے۔

کتاب "المراۃ الجدیدہ" کے مؤلف فرماتے ہیں :-

> پردہ کا یہ نقصان ہے کہ وہ عورت کو اس کی فطری حریت سے محروم بنا دیتا ہے۔ اس کو اپنی تربیت کامل کر سکنے سے روکتا ہے۔ بوقتِ ضرورت اسے اپنی روزی خود کما سکنے سے باز رکھتا ہے۔ اور بیوی اور شوہر دونوں کو عقلی اور اخلاقی زندگی کا مزہ نہیں چکھنے دیتا۔ اور پردہ کی پابند رہنے کی حالت میں ایسی قابل مائیں پیدا نہیں ہو سکتیں جو اپنی اولاد کی اعلیٰ تربیت پر قادر ہوں اور اسی پردہ کی وجہ سے قوم کی حالت اس انسان کے مانند ہو جاتی ہے جس کے بدن کا ایک حصہ جھولا مار گیا ہو۔

اب ہم کہتے ہیں کہ ہماری اگلی حسی براہین کی بنیاد پر پردہ میں حسبِ ذیل فوائد ہیں۔ پردہ عورت کو اسکی حقیقی حریت سے مُتمتع بناتا ہے۔ اور یہ بات تم کو معلوم ہو چکی ہے کہ عورت کی اصلی حریت کیا ہے۔ پردہ عورت کو موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے نفس کی تربیت کمل کر سکے۔ کون سی تربیت؟ جو ایک ماں کو ملنی چاہیئے۔ پردہ

عورت کو مردوں کے ساتھ ان کے کاموں میں شریک ہونے سے روکتا ہے کیسی شرکت؟ جس نے اس مادی مدنیت کی ہڈی تک نرم کردی ہے۔ اور جس پر اس مدنیت کے دونوں برّاعظم یورپ و امریکہ کے نامور علماء شہادت دے رہے ہیں۔ اور وہاں کے بسنے والوں اور وہاں کی حکومتوں پر زور ڈالتے ہیں کہ وہ مناسب طریقوں سے عورت کی زندگی بسر کرنے کی ضمانت کا انتظام کریں۔ پردہ بیوی اور شوہر دونوں کو زناشوئی کی زندگی سے لطف اٹھانے کا موقع دیتا ہے۔ پردہ ہی کے ذریعے سے ایسی مائیں پیدا ہو سکتی ہیں جو اپنی اولاد کو اسلامی اصول پر تربیت دینے کے قابل اور اس پر بخوبی قادر ہوں۔ اور پردہ ہی کے سبب سے قوم کی حالت اس صحیح البدن انسان کے ساتھ مشابہ ہوتی ہے جس کے ظاہری قوی اعضاء کے علاوہ چند دوسرے طاقتور باطنی اعضاء بھی ہوں۔

ہم بھی نہایت سہولت سے کہہ سکتے تھے کہ " مرد کے لیے اس سے بہتر حالت کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے پہلو میں ایک ایسی ساتھی ہو جو رات دن، سفر، حضر، تندرستی، بیماری، رنج و راحت ہر ایک حال میں اس کی مونس و غمگسار رہے جو عقل و ادب کی پتلی ہو۔ اپنے شوہر کی تمام ضرورتوں سے واقف۔ اس کی پوری مزاج دان، اس کے گھر کی منتظم، اس کی صحت کی محافظ، اس کی عزت کا خیال رکھنے والی۔ اس کے کاموں کو جاری کرنے والی۔ اسے اس کے فرائض و حقوق سے مطلع کرنے والی۔ اور اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین رکھنے والی ہو کہ اگر وہ اپنے شوہر کے فائدہ رسانی کی کوشش کرے گی تو دراصل یہ خود اپنے ہی فائدے کی بات ہے۔ اور اسی کے لیے شوہر و اولاد کے لیے مفید ہے "

" کیا وہ مرد بھی خوش نصیب شمار ہو سکتا ہے جس کے پہلو میں ایسی آرام جاں بیوی نہ ہو جس نے اپنی زندگی شوہر کی زندگی پر وقف کر دی ہو۔ وہ صداقت کی دیوی اور کمال کی مجسم تصویر ہو تاکہ شوہر اس پر دل و جان نثار کرے۔ ہر وقت اس کی خوشنودی کا طالب رہے مناصبِ زندگی کے افضل ترین کاموں میں اس مونس و ہمراز کی مدد حاصل کرے۔ اور اس سے بہتر سے بہتر اخلاق و آداب کا سبق سیکھے۔ ایسی سچی ہمدم جو اس کے گھر کی رونق، اس کے دل کی مسرت، اس کے اوقاتِ فراغت کے لیے مشغلۂ دلچسپی اور اس کے رنج و الم کو دور کرنے کے لیے شگفتہ پھول کی طرح کار آمد ہو "

ہم کہتے ہیں کیا ہمیں ایسی دلفریب باتیں نہیں آتیں؟ آتی ہیں اور ضرور آتی ہیں۔ بلکہ ہم اس سے بھی بہتر اور اعلیٰ عبارت میں رنگین اور دل نشین جملے لکھ سکتے ہیں۔ مگر بات یہ ہے کہ ہم علم اور تحقیق کے مقام

پر کھڑے ہیں۔ تمنا و آرزو کے سبز باغ کی سیر نہیں کرتے۔ دنیا میں کوئی ایک مرد بھی ایسا نہیں ملے گا جس کے نگۂ خیال میں یہ دل خوش کن آرزوئیں بلکہ اس سے بڑھ چڑھ کر امیدیں نہ آتی ہوں لیکن خارج میں ان کا ایک فی صدی حصہ بھی ظہور نہیں پاتا جس کی علت یہ ہے کہ کاروبارِ عالم کی کنجیاں انسان کے ہاتھوں میں نہیں دی گئی ہیں۔ ورنہ اگر ہر ایک متمنی اپنی تمام آرزوئیں پوری طرح حاصل کر سکتا تو آج دنیا میں کوئی حسرت زدہ اور بدنصیب شخص تلاش کرنے پر بھی نہ ملتا۔ کاش! شخصی احوال کی اصلاح ایسی ہی سخن پروری سے ہو سکتی تو فاضل اہلِ قلم کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا آسانی ہو سکتی تھی۔

مثلاً ہم یوں کہہ سکتے تھے۔ انسان کو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے کہ وہ ایک سرسبز اور خوش نما باغ کے وسط میں ایک فرشِ شاہانہ محل کے اندر رہتا ہو۔ اس کے سامنے خدمتگاروں اور نوکروں کی ایک جماعت اشاروں پر کام کرنے کے لیے تیار و ایستادہ رہتی ہو۔ جو اپنے آقا کے دل پر رنج و فکر کی کدورت نہ آنے دیں۔ اور خود وہ شخص ان بلند حوصلہ اور عالی ہمت و روشن خیال لوگوں میں سے ہو جو اپنی سوسائٹی اور قوم کی بہتر سے بہتر خدمتیں انجام دے کر اپنا نام تاریخ کے صفحوں پر آبِ زر سے لکھے جانے کیلیے چھوڑ جاتے ہیں۔ جو زمانہ میں ضرب المثل بنتے ہیں۔ اور بعد میں دوسرے کام کرنے والوں کو ان کی نظیر دے کر سعی و ہمت کرنے کا حوصلہ دلایا جاتا ہے۔ پھر اس شخص کے اولاد بھی ہو تو نہایت وہ اپنے شریف خیالات کی اتباع پر تربیت و تعلیم دے کر ان کو بھی اپنی ہی ایسی پاکیزہ زندگی اور عالی مرتبہ مقام حاصل کرنے کے لائق بنائے۔ اور خدا نے اس کو تمام باتوں میں اعتدال پسندی کی شریف عادت عطا کی ہو جس کے سبب سے، وہ اس اعلیٰ درجہ کی نعمت و عظمت میں پاک نفس اور خدا ترس لوگوں کی ایسی زندگی بسر کرے جس سے خود وہ، اس کی اولاد اور گرد و پیش بیماریوں اور پریشانیوں کی زد سے بچے رہیں۔ پھر تو وہ خوش نصیبوں کی طرح زندگی بسر کر کے شہیدوں کی سی موت پائے گا۔

کیا اس میں شک ہے کہ ہر ایک انسان ان دل خوش کن امیدوں کو پسندیدگی سے دیکھے گا؟ ضرور دیکھے گا۔ بلکہ چاہے گا کہ میں اس عبارت میں اور بھی اضافہ کرتا کیونکہ یہ باتیں اس کی دلی خواہشوں سے بالکل مطابق ہیں۔ مگر ذرا خدا لگتی کہہ کہ مجھے یہ تو بتاؤ کہ اس دنیائے فانی میں کتنے آدمیوں نے ایسی سعید زندگی حاصل کی ہے۔ اور کتنے آدمیوں کی نسبت یہ کہنا درست ہو گا کہ وہ اس حالت کو حاصل کرتے کرتے رہ گئے؟

نامور علماء اور فلاسفر بہت کچھ غور و تامل کے بعد دو بڑی قسموں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ایک قسم کے فلاسفر دعویٰ کرتے ہیں کہ اس دنیا میں خوشی اور آرام کا مطلقاً نام ہی نہیں۔ یہ زندگی سرتاسر مصیبتوں، رنج و الم، پریشانیوں اور ہر طرح کی آفتوں سے بھری ہے۔ اس لیے وہ لوگ مایوس ہو جانے والوں کی طرح اس سے اپنا پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور دوسری قسم کے فلاسفروں کی یہ رائے ہے کہ دنیاوی زندگی میں خوبیاں بھی ہیں اور خرابیاں بھی۔ اور خوش نصیب وہ شخص ہے جو اس فانی زندگی کی خوبیوں سے بقدرِ امکان نفع اٹھانے کا طریقہ معلوم کرے اور سمجھ جائے کہ اس کی برائیوں سے جس قدر ہو سکے کیونکر دور رہ سکتے ہیں۔ ایسا شخص زندگی بھر اس دنیاوی سمندر میں آخری عمر تک موجوں کے تھپیڑے کھاتا رہتا ہے۔ کبھی ایسے رنج و الم کی گراں بار موج اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور گاہے مسرت کا کوئی ہلکا سا چھینٹا اس پر آپڑتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے دنیاوی وجود کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور وہ اس دوسرے عالم میں جا پہنچتا ہے جہاں اس کی طویل زندگانی کے جہاد کے نتائج اس کا انتظار دیکھتے ہوتے ہیں پھر یا اسے ابدی راحت نصیب ہوتی ہے یا دوامی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اور ان دونوں مذہبوں میں پہلی شق کی طرف تو ہمیں بالطبع کوئی میلان نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی تعلیمیں محسوس بدیہی امور کے منافی ہیں۔ رہی دوسری شق، وہ قابلِ غور اور دنیا کی زندگی کے لیے قابلِ عمل طریقہ بنانے کے لیے لائق سزاوار ہے۔ مگر اس ناتواں انسان پر جو بعض اوقات آرام و راحت اور آفت و مصیبت کے وجوہ میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ اس زندگی کی تکلیفیں اتنی شاق اور سخت ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ کبھی سعادت کو چھوڑ کر شقاوت کی طرف جانے کی کوشش کرتا ہے مگر اس طرح وہ ایک ایسی مشکل میں پھنس جاتا ہے جس سے وہ بخیالِ خود دور رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور اب اس میں مبتلا ہو گیا ہے۔

اس دنیاوی ہستی میں کوئی ایسی خوبی نہیں جس کے ساتھ کچھ شر نہ ملا ہو ؎

ہر جا کہ گل است خار است

و ہر جا کہ نور است نار است

اس لیے جو شخص اس بشری اور خوبی کو ہر طرح کے شر و فساد سے پاک بنانے کی قوت رکھتا ہو اس میں شک نہیں کہ وہی خوش نصیبوں کی سی زندگی بسر کرے گا۔ اور اصحاب صفا کا مرتبہ حاصل کرے گا۔ لیکن

یہ بات حاصل ہو تو کیونکر؟ انسان اپنی جملہ ضروریاتِ زندگی کے بارہ میں مستقل بالذات نہیں اور نہ بلا امداد غیرے ان سب کو پورا کر سکتا ہے۔ انسان کو ہر ایک کام میں اس کے ساتھ شریک ہیں ان کی طرف سے ایسی رکاوٹیں اور دقتیں پیش آنا شروع ہوتی ہیں کہ ایک دقت کو دور بھی کیا جائے تو اس کے فوراً بعد دوسری مشکل آ کے آجاتی ہے۔ اور اسی طرح انسان کی یہ فانی ہستی حصولِ مطلوب کی امید بندھنے سے قبل تمام ہوتی ہے۔

بہت سے آدمی ایک چیز کو ہر طرح بہتر مفید جانتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ باوجود اس کی خواہش رکھنے کے اس سے دور بھاگتے ہیں آخر یہ کیا بات ہے؟ ان کو اتنی قدرت ہے کہ کوشش کریں تو وہ بات حاصل کریں۔ لیکن سوسائٹی اور قومی معاشرت یا خاندانی حالت انہیں اس کا موقعہ نہیں دیتی کہ اپنی آرزو پوری کر سکیں۔

یہ تمام باتیں انسان کے دل پر ایسی کدورت اور پراگندگی طاری کرتی ہیں جن سے وہ سخت تکلیف دہ فکروں کے بار سے دب کر رہ جاتا ہے۔ اور اسے کچھ سوجھ نہیں پڑتا کہ کیا کرے۔ لیکن اسی کے ساتھ اگر وہ دل کو مضبوط کر کے اپنے نفس کی طرف رجوع کرے، اور ہوش ٹھکانے کر کے اس ذاتِ بابرکات کی طرف متوجہ ہو جس کے قبضۂ قدرت میں تمام آسمانوں اور زمین کی باگیں ہیں پھر اس سے اطمینانِ قلب کی دعا مانگے تو اسے پوری طرح اعتقاد ہو سکتا ہے کہ پاک خدا نے جتنی چیزیں بنائی ہیں سب پوری کاریگری کے ساتھ، اور اس کی کوئی مخلوق کسی خوبی سے خالی نہیں اور لامحالہ یہ اسی کا حکم ہے کہ خیر و شر اس عالمِ ارضی کے لوازم میں ہوں جس کی حکمتِ بالغہ اور مقصدِ عظیم کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔

وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً وَإِلَيْنَا تُرْجَعُونَ[1] اور ہم تو نیکی و بدی میں آزماتے کے لیے مبتلا کرتے ہیں اور تم ہماری ہی جانب واپس آؤ گے۔ اس لیے جو شخص ان بادِ مخالف اور متعاکس ہواؤں کے جھونکوں میں اپنی جگہ پہ قائم اور اعتدال کا پابند رہے اسی کو ابدی بہتری نصیب ہو سکتی ہے ورنہ جو شخص دائیں بائیں جھکا۔ اور ناممکن الحصول آرزوؤں کے دبے ہوا تو اس کا حساب خدا کی جناب میں دے گا۔

انسان کو صرف یہی بات پسند نہیں ہوتی کہ اس کی بیوی نیک طینت ہونے کے ساتھ ہی بے پردہ؛ بے نقاب اس کے پہلو بہ پہلو سیر و تفریح بھی کرتی پھرے۔ بلکہ اس کو تو یہ آرزو ہوتی ہے کہ میری حالت اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے کوئی تکلیف چھو بھی نہ جائے موت نہ آئے

[1] سورۃ الانبیاء آیت ۳۵

تنگدستی اور بیماری کا اسے نام بھی معلوم نہ ہو۔ اور اس کی تمنا ہوتی ہے کہ اپنے اہل ملک اور ہم جنسوں سب
کو یکساں مسرت و کامرانی کی مبارک حالت میں دیکھے مگر افسوس کہ یہ تمام باتیں خیالی پلاؤ پکانے سے
زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ انسان کو تکلیف پہنچنی بھی ضروری ہے۔ موت سے اس کو مفر نہیں۔ تنگدستی
بھی اسے ستائے گی۔ اور خلاف طبیعت اُمور سے بھی اسے سابقہ پڑے گا۔ اور انسان کے لیے یہ بھی
لابدی امر ہے کہ اس کی آزادی و خودمختاری پر روک ٹوک کر کے اسے حریت کی لذت سے بے بہرہ
بنایا جائے تاکہ وہ بہت سی ایسی آفتوں سے بچ سکے جو بغیر اس صورت کے اور کسی طرح سے دور
نہیں رہ سکتی ہیں۔

میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ پردہ میں ایک طرح کی خرابی بھی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ میرا
یہ بھی خیال ہے کہ پردہ گو بذاتہ مصیبت ہے مگر ایک بڑی مصیبت سے بچانے والا بھی ہے اور
بایں لحاظ اس کو اچھا بھی سمجھنا چاہیئے۔ لہٰذا ہم انسانوں پر واجب ہے کہ ہر ایک بات میں اپنی دلی
خواہشوں ہی کی متابعت پر کمر نہ باندھ لیں۔ کیونکہ بہت سی چیزیں جن کو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں
ہمیں نہیں بھی ملتی ہیں۔ اور جو چیزیں ہم کو حاصل ہوتی ہیں۔ ان میں بعض ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جن کے
دستیاب ہونے کا ہمیں شائبہ و گمان بھی نہیں ہوتا بلکہ اگر وہ چیزیں ہمارے اُن کی آرزو کرنے سے قبل
ہم پر پوری طرح ظاہر ہو جاتیں تو ہم ان سے منزلوں دور بھاگنے کی سعی کرتے۔

جو لوگ مسئلہ نسواں پر گفتگو کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر لوگوں کو میں یہ خیال کرتے دیکھتا ہوں کہ
کامل مردوں کے ذہن میں ایک ایسی کاملہ اور نقص و عیب سے بری عورت ہے جس میں ہر طرح کی خوبیاں
اور قابل تعریف باتیں جمع ہیں اور مطلقاً شائبہ نقائص سے مبرا ہونے کی وجہ سے بے حد دلفریب
خیالی نمونہ ہوتی ہے۔ گویا وہ عورت حسن صورت اور خوبی سیرت میں کامل اپنے شوہر کی آنکھ کی پتلی اپنے
گھرانے اور کنبہ کے دل کی ٹھنڈک، اعلیٰ تربیت یافتہ، اپنے وظیفہ طبعی کے فرائض سے واقف
اور گھر کے کاموں کو پوری طرح انجام دینے والی ہے۔ پھر اس کے بعد وہ اپنے بیش بہا وقت کا
معتدبہ حصہ خارجی معاملات اور قومی اصلاح کے متعلق علمائی علمی بحثوں فلاسفہ کے اخلاقی مذاکروں
اور سیاحوں کے جغرافی تحقیقوں میں شریک ہونے پر بھی خرچ کرتی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس
عورت میں داخلی اور خارجی تمام خوبیاں موجود ہوں۔ ہم بھی مانتے ہیں کہ اگر یہ امید فی الواقع بر آتی یا اس

کا پورا ہونا ممکن ہوتا تو بہت اچھی بات تھی۔ لیکن قوانینِ حیات کی ایک رفتار ایسی ہے جو ہمارے گمان میں نہیں آسکتی۔ اور حالاتِ دنیا کے چند ایسے دور ہیں جو عقل مند سے عقل مند انسان کے تصور میں بھی نہیں آتے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ فاضل اہلِ قلم کی بہت سی تحریریں بالکل بے اثر رہتی ہیں۔ جس وقت ہم سوسائٹی کے حالات میں سے کسی حال پر گفتگو چھیڑیں تو پہلے ہم پر واجب ہے کہ جس عالم میں ہم رہتے ہیں اس کی ماہیت کو اپنے خیال میں جمائیں۔ پھر دیکھیں کہ اس میں کس قدر نقصان ہے اور کتنا کمال اور نیز ان دونوں باتوں کو نفسانی حالات و اطوار سے کیا تعلق ہے۔ تاکہ ہم حکم لگانے میں غلطی سے بچ سکیں۔ اور ہماری نصیحتیں ناممکن الحصول خیالات سے خالی ہوں۔ مثلاً جس وقت ہم مسئلۂ نسواں کی گفتگو چھیڑنے پر آمادہ ہوں تو سب سے پہلے ہمیں اس بات پر نظر کرنی چاہیے کہ ہم اس مخلوق کی بابت کچھ کہنا چاہتے ہیں جو مرد کے مقابل اور ایسی قوم میں موجود ہے جس کے تمام افراد ایسے ہیں جن میں فساد و شرارت، ہوا و ہوس اور نقائص موجود ہیں اور ہم اس عالمِ ارضی میں ہیں جو برائیوں اور مصیبتوں سے مبرا نہیں۔ بیشک اگر یہ باتیں پہلے ہی ہمارے ذہن نشین ہو جائیں گی تو ہمارا بے جا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ جائے گا اور ہم اپنی عقل اور تقریر کو قابو میں رکھ کر ایسی باتیں تحریر کریں گے جو قانونِ موجود سے الگ اور فطرتِ انسانی کے خلاف نہ ہوں گی اور ہمارے اس کام کا کچھ اثر بھی ہو گا جو ہماری محنت کو ٹھکانے لگائے گا۔

لوگ کہتے ہیں کہ پردہ میں یہ نقصانات ہیں جو صحت پر سب سے پہلے بڑا اثر ڈالتے ہیں۔

۱- پردہ عورت کی صحت کو برباد کر کے ایسی بیماریوں کا شکار بنا دیتا ہے جس سے [illegible] اعصاب ضعیف ہو جاتے ہیں۔ اور پٹھوں کی کمزوری، خلاقی قوتوں میں خلل پڑنے کا موجب [illegible] ہے [illegible] قانون [illegible] یہ قول ہے کہ پردہ نشین عورت اپنی اولاد [illegible] میں کمزور رہتی ہے [illegible] کی صحت اور درستی [illegible] سکتے ہیں، بڑی مدد [illegible] ان کی کمزوری [illegible] خواہشوں کو روک نہ سکے۔ اور [illegible] بن جاتے ہیں۔

۲- پردہ کی وجہ سے شادی کا خواہاں مرد بیوی کو آئندہ [illegible] دیکھ نہیں سکتا [illegible]

طلاق اور عورت مرد کی باہمی ناچاقی کا بڑا باعث ہے۔

۳۔ پردہ ہی عورت کو تہذیب و علم حاصل کرنے سے روکتا ہے اور اسے حسبِ خواہش مدرسوں اور بورڈنگ ہاؤسوں میں رہ کر اپنی عقلی اور اخلاقی قوتوں کو بڑھانے سے باز رکھتا ہے۔

اب ہم تینوں شبہوں کی تردید کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ پردہ نشین عورتیں نہ مریض ہیں نہ ضعیف الاعصاب بلکہ وہ بحیثیتِ مجموعی بے نقاب پھرنے والی عورتوں سے کہیں بڑھ کر تندرست اور قوی ہیں۔ اور یہ ایک ایسا قضیہ ہے جس پر ہر ایک ایشیائی سرسری نظر کے بعد ہی صداقت کا حکم لگا دے گا۔ تیرہ سو برس گزر گئے کہ مسلمان عورتیں پردہ میں رہتی ہیں۔ اگر پردہ عورتوں میں کوئی کمزوری پیدا کرتا تو ضروری تھا کہ وہ ان میں نسلاً بعد نسلٍ بطورِ وراثت زیادہ ہوتی جاتی اور آج مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں کمزوری و ناتوانی کی زندہ مثالیں پائی جاتیں۔ کیونکہ علم "بائی لوجی" کے قواعد صاف یہی حکم دیتے ہیں۔ مگر جہاں ہم معاملہ اس کے بالکل برعکس پاتے ہیں دیکھا جاتا ہے کہ پردہ نشین عورتوں کے بیٹے بے پردہ عورتوں کی اولادِ نرینہ سے زیادہ قوی الجثہ ہوتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی محکمۂ تندرستی و حفظانِ صحت کے اعداد و شمار کی رپورٹیں قطعاً اس بات پر دلالت نہیں کرتی ہیں کہ ایسی عورتوں کے فوت ہونے کی تعداد زیادہ ہے۔ اس لیے اگر پردہ صحت کے لیے مضر ہوتا تو عورتوں کا بکثرت مرنا ضروری تھا۔ اور ان میں فوت ہونے کی تعداد طبعاً مردوں کی نسبت بڑھی ہوئی رہنی چاہیئے تھی۔ اور یہ بات مشاہدہ کے خلاف ہے۔

اب رہا آزادیٔ نسواں کے حامیوں کا یہ قول کہ "پردہ نشین عورتیں اپنی نفسانی خواہشوں کی لونڈی بنی رہتی ہیں" عجیب بے جوڑ بات ہے۔ علمی علم سائیکولوجی کے قواعد پر اس دعویٰ کا ذرا بھی انطباق نہیں ہو سکتا۔ ہر ایک شخص جانتا ہے کہ انسان میں نفسانی خواہشوں کا اسی وقت زیادہ زور ہوگا جبکہ وہ ان خواہشوں کو ابھارنے والے اسباب میں گھرا ہوا رہے۔ اور ہوا وہوس کا جوش اسی وقت عقل کو مغلوب بنا سکتا ہے جس وقت کہ انسان کو اپنا مطلوب بآسانی میسر آسکے اس لحاظ سے ہم سوال کرتے ہیں کہ انصاف و عقل کے احاطہ سے قدم نہ نکال کر کوئی ہمیں بتلا دے کہ نفسانی جذبات کو اشتعال دینے والے سامان کس عورت کے لیے زیادہ بہم پہنچ سکتے ہیں پردہ نشین کے واسطے یا کھلے بندوں پھرنے والی عورت کے لیے؟ کیا جو عورت پشت در پشت سے

میراث میں چلی آنے والی دینی غیرت کی وجہ سے غیر مردوں کی ہم نشینی سے دور بھاگتی ہے اس پر شہوت انگیز ذرائع کا اثر پڑے گا یا اس عورت پر جو بے دھڑک غیر و نا محرم مردوں میں مل جل رہتی ہے؟ کیا طبعاً دوسری ہی عورت اس حکم کے لیے موزوں نہیں؟ اور علاوہ بریں علم سائیکولوجی بھی ہمارے لیے اس بات کی سب سے بڑی شہادت بہم پہنچا رہا ہے۔ کہ ہمارا دعویٰ صحیح ہے۔ پھر بھی ہم اس دلیل کو ایک طرف رکھ کر ایک دوسری دلیل یہ پیش کرتے ہیں۔ کہ انسان کو اپنی دلی آرزوئیں بر لانے میں سہولت حاصل ہو تو اس بات کا اس پر بڑا اثر پڑتا ہے یعنی اس کی شرم و حیا اور غیرت و خود داری کا پردہ چاک ہو جاتا اسے اپنی طبیعت پر قابو نہیں رہتا اور وہ ضرور ہوا و ہوس کی گندگی میں آلودہ ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال کے لیے یوں سمجھو کہ دو ہم عمر و ہم جماعت نوجوان جنہوں نے ایک ہی مدرسہ میں تعلیم پائی ہے۔ اور ایک ہی مربی کی زیر نگرانی رہے ہیں۔ ایسے ہیں کہ ان میں سے ایک اپنے خاندان سے دور پڑا ہے اور بجز اپنی ذاتی تہذیب و متانت اور بدنامی سے خوف رکھنے کے کوئی ایسی رکاوٹ اس کے سامنے موجود نہیں جو اسے اپنی دلی امنگیں پوری کرنے سے روک سکے۔ اور دوسرا نوجوان اپنے کنبہ والوں میں محصور اور ہر طرف سے نگرانی میں پھنسا ہوا ہے اس لیے اس کے اور اس کی نفسانی خواہشوں کے مابین بہت سی اس طرح کی رکاوٹیں حائل ہیں کہ اگر وہ ایک رکاوٹ کو دور کرتا ہے تو دوسری اس کی جگہ سامنے آجاتی ہے۔ پھر اس صورت میں دونوں نوجوانوں میں سے کس کو اپنی امنگیں پوری کرنے کا زائد میلان ہو گا اور کس کا دل قابو سے باہر ہو جائے گا؟ بدیہی طور پر اور بلا تردد کہا جا سکتا ہے کہ پہلا نوجوان ہی اس تیر بلا کا نشانہ بنے گا۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کی تندرستی اور اس کے مجموعۂ عصبی کا نظام اس میں شباب کی ترنگ اٹھنے سے روک دے گا؟ کبھی نہیں بلکہ یہ حالت تو اور بھی اس کے جوش میں اضافہ کرے گی اور اسے ہر ایک وسیلہ سے اپنی خواہش پوری کرنے پر آمادہ بنائے گی۔ اور یہ بات روزمرہ کے تجربات اور مشاہدہ سے بخوبی ثابت ہو رہی ہے۔ کیونکہ یہ بات صحیح نہ ہوتی تو لازم آتا کہ ہر ایک تندرست آدمی کا دل بھی برائیوں سے پاک ہو جو ایک خلاف امر ہے۔ اس لیے تمام بدچلن اور فاسق و فاجر لوگ باغلب وجوہ دوسرے آدمیوں سے نسبتاً قوی اور زور آور ہوتے ہیں۔ اس مقام پر شاید کوئی صاحب یہ کہہ اٹھیں کہ بدچلن اشخاص کو تہذیب و انسانیت سے کیا تعلق؟ اگر ان میں جسمانی صحت کے ساتھ

عقل و تہذیب کی صحت بھی جمع ہوتی تو ان کی یہی تہذیب انہیں ہر ایک اخلاقی برائی سے پوری طرح روک دیتی۔ یہ بات ہر روز آنکھوں سے دیکھی جاتی ہے کہ اکثر رندمشرب اور عیش پسند وہی لوگ ہوتے ہیں جو تہذیب کے زیور سے آراستہ اور روشن دماغ تصور کیے جاتے ہیں۔ بلکہ ایسے لوگوں میں زیادہ تعداد ان اصحاب کی ہے جو یورپ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ لیکن باوجود مغربی تہذیب سے بہرہ ور ہونے کے اوروں کی نسبت وہ کہیں زیادہ اپنی خواہشوں کے بندے ہیں۔ جو تربیتِ انسان کو خلاف ادب اور انسانیت کام کرنے سے روکتی ہے وہ صرف چند افراد میں پائی جاتی ہے جن کو فلسفر اور حکماء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے حاصل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ مدت ہائے مدید تک حقائق اشیاء پر غور کر کے اپنے دل و دماغ کو صحیفۂ کائنات کے مطالعہ میں مشغول رکھیں۔ اور جب دماغ میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جائے کہ وہ خلافِ تہذیب امور کو قبول ہی نہ کرے۔ تب کہیں جا کر کامل کہلائیں گے۔ اب تمام قوموں کی ہستی پر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسے روشن خیال لوگ ان میں معدودے چند سے زائد نہ ہوں گے۔ ورنہ سوادِ اعظم اور بڑا حصہ اس تہذیب و متانت سے بالکل خالی اور لباس صلاح سے عاری ہوگا۔ یہاں تک کہ آئندہ زمانہ میں بھی ایسی حالت پیدا ہونے کی کوئی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ میرا یہ قول روز مرہ پیش آنے والے واقعات کو اپنا شاہد بناتا ہے۔ اور ہر ایک دانا و بینا آدمی بآسانی اس بات کا ثبوت حاصل کر سکتا ہے۔

جب یہ بات قرار پا چکی تو اب ظاہر ہے کہ ایک محفوظ اور پردہ نشین عورت نفسانی خواہشوں کی طرف بہت کم مائل ہو گی اور اس کے دماغ میں ایسے خیالات شاذ و نادر ہی گزریں گے بخلاف اس کے کھلے بندوں پھرنے والی عورتوں میں یقیناً اس طرح کی خواہشوں کا زور ہوگا جو مانی ہوئی بات ہے۔

ضعفِ اعصاب اور قوتِ عقلیہ کی کمی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس معاملہ میں بھی مغربی ممالک کی عورتوں کا نمبر ایشیائی ملکوں کی عورتوں سے بڑھا ہوا ہے۔ عصبی کمزوری محض پردہ نشینی اور گھروں کی چار دیواریوں میں محفوظ ہو کر بیٹھنے سے نہیں پیدا ہوتی ہے بلکہ اس کے اسباب بکثرت ہیں جن میں سے چند امور شدتِ رنج و الم، تنگدستی، فاقہ مستی، عشق و محبت وغیرہ وغیرہ ہیں۔ جو شخص کسی طبی مجموعہ کو اٹھا کر ذرا غور کی نگاہ سے دیکھے گا اس پر واضح ہو جائے گا کہ یہ باتیں یورپین عورتوں

کے واسطے ایک معمولی بات بن گئی ہیں۔ اس کے ساتھ کسی قوم میں ضعفِ اعصاب کی علت موجود ہونے کی اور بھی بے حد نشانیاں ہیں جن میں سب سے اہم علامت خودکشی کی کثرت ہے۔ اسبابِ جرائم کی تحقیق و تفتیش کرنے والے علماء "لومبروزو" وغیرہ نے ثابت کیا ہے کہ انسان قوتِ عقل کے صحیح ہونے کی حالت میں قتل و خودکشی کے جرم کا ہرگز مرتکب نہیں ہوتا۔ اور چونکہ قوتِ عقلیہ کی درستی صحتِ اعصاب کی تابع ہے اس لیے کثرتِ خودکشی اس بات کی ایک عملی علامت بن کر ہم کو صاف صاف بتا رہی ہے کہ کس دنیا کی عورتیں سب سے زیادہ ضعیف الاعصاب ہیں۔

ریویو آف ریویوز جلد ۱۱ میں اٹالیا کی سرکاری رپورٹوں سے واضح کیا گیا ہے کہ وہاں سے ۱۸۸۹ء سے ۱۸۹۳ء تک ۵ سال کی مدت میں ۵۶۹ عورتوں نے خودکشی کی اور اتنے ہی عرصہ میں ملک فرانس کے اندر ۵۸۶۹ عورتیں خودکشی کر کے مریں۔ اب ان اعداد کو پیشِ نظر رکھ کر ہمیں کوئی بتائے کہ ہمارے ایشیائی ممالک میں کس قدر عورتیں خودکشی کی مرتکب ہوئیں ؟ اور پھر اس خودکشی کو محبت، تنگدستی اور اس کے علاوہ جس سبب کے ساتھ چاہے منسوب کیا جائے لیکن وہ بحرحال بزدلی اور ضعفِ اعصاب ہی کا نتیجہ ٹھہرتی ہے۔ اس لیے مشرقی ملکوں کی عورتیں یورپین ممالک کی عورتوں سے کئی درجے بڑھ کر قوی الاعصاب اور اپنے نفسانی جذبات کے دبا لینے پر بہت زیادہ قوت رکھنے والی ہیں۔

اور جبکہ انسان کا نفسانی خواہشوں پر مائل اور ضبطِ نفس پر نہ قادر ہونا براہِ راست ضعفِ اعصاب ہی کا نتیجہ ہے تو اس لحاظ سے مشرقی ممالک کے لوگ مغربی ملکوں کے باشندوں سے قوتِ اعصاب میں بڑھے ہوئے نکلیں گے۔ کیونکہ اہلِ یورپ باوجود اس کے کہ ان کے تمام طبقات میں تہذیب پھیل گئی ہے۔ اس بات کو بخوبی جانتے ہوئے کہ نشہ آور چیزوں کا استعمال مضرت رساں اور قاتل امر ہے آج تک اس عادت کو بالکل نہ ترک کر سکے۔ حالانکہ روزمرہ اس عادتِ بد کی وجہ سے وہ جانی، مالی اور عقلی نقصانات بھی اٹھاتے رہتے ہیں۔ اور اسی پر دوسری نفسانی خواہشوں کا اندازہ لگا لو کہ یورپین ملکوں میں ان کا زور مشرقی دنیا سے کئی درجہ بڑھا ہوا پایا جاتا ہے۔

دوسرا نقصان پردہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ وہ مرد کو اس عورت کی صورت دیکھنے کا موقع نہیں دیتا جو آئندہ اس کی شریک زندگی اور ہمدم بنے گی۔ اور اسی امر پر وہ زوجین کی باہمی ناچاکیوں

اور کثرتِ طلاق کی بنیاد رکھتے ہیں کہ عورتوں کو جس قدر شکائتیں مردوں کی طرف سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی جڑ یہی اصولی خرابی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ اعتراض بالکل غلط ہے کیونکہ کثرتِ طلاق یا مردوں کے ظلم و تعدی کرنے کی شکایت کچھ مسلمانوں ہی کے دائرہ میں مخصوص نہیں بلکہ متمدن ملکوں میں اس کا شور و شر ہمارے یہاں سے بہت زیادہ ہے۔ مہربانی فرماکر ناظرین ہماری اس کتاب کے اسی فصل پر نظر ڈالیں جس کا عنوان ہے "کیا وہی پوری عورت ہے جو مادی تمدن کی پابند ہو؟ حقیقتِ حال سے خود واقفیت ہو جائے گی۔

اب رہا تیسرا اعتراض کہ پردہ عورتوں کو تہذیب حاصل کرنے اور علم کی تحصیل سے باز رکھتا ہے۔ یہ بھی محض لغو اور بے معنی ہے۔ کیونکہ ایک لڑکی سات سال کی عمر سے لے کر بارہ سال کی عمر تک برابر مدرسہ میں رہ سکتی اور ان پانچ سال کے عرصہ میں اپنی عقل کو بہت اعلیٰ درجہ کی تہذیب و سلیقہ کے زیور سے آراستہ بنا سکتی ہے۔ قومی خیرخواہوں اور ہمارے ریفارمروں کے لیے یہ کوئی ناممکن بات نہیں کہ وہ تعلیم نسواں کے ایسے اعلیٰ مدارس اور کالج قائم کر دیں جن میں تمام تعلیم و تربیت دینے والی کارکن عورتیں ہی عورتیں ہوں اور ایسے مدارس میں لڑکیاں بے نقاب رہ سکتی ہیں۔ ہاں وہاں جاتے ہوئے یا مدرسہ سے نکل کر گھر آتے ہوئے راستہ میں اپنا چہرہ نقاب سے چھپا لیں گی۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ ایسی لائق معلمہ عورتیں کہاں سے نصیب ہو سکتی ہیں تو یہ خواہ مخواہ کی سخن سازی ہے جس کو ہم کبھی صحیح مان ہی نہیں سکتے کیونکہ

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد

اگر خارے بود گلدستہ گردد

ہمت شرط ہے اور کام کرنے کے لیے ذرا سی توجہ میں سب کچھ ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ کیا ضرورت ہے کہ ہم ہر ایک کام ایک ہی وقت میں کرنے پر آمادہ ہو کر طلب الکل فوت الکل کا مصداق بن جائیں۔ کیونکہ ابتداء میں کسی کام کو تھوڑا تھوڑا اٹھا کر بتدریج کمال کے اوج پر پہنچایا جا سکتا ہے۔

ان تمام مراتب کے بعد اب ہم کہتے ہیں کہ پردہ نہ مضرِ صحت ہے نہ اعصاب کا کمزور کرنے والا۔ نہ اس سے نفسانی خواہشوں کا جوش بڑھتا ہے اور نہ وہ بداخلاقیوں کی جڑ ہے

بلکہ بہ نظرِ انصاف دیکھا جائے تو پردہ بہت سی خراب باتوں اور قابلِ شرم و نفرت امور کے سامنے ایک مادی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ اور اگر اس پر کسی اخلاقی رکاوٹ کا اور بھی اضافہ کر دیا جائے تو نورٌ علیٰ نور ہو کر انسان کی تمام ان خرابیوں اور برائیوں کو مٹا ڈالے جو موجودہ مدنیت کے جسم پر کاری زخم نظر آتے ہیں۔

پردہ مٹ جائے گا؟

پردہ کا نابود ہو جانا اور ہمارا ان تمام آفتوں میں پھنسنا جنہیں ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ کوئی ناممکن امر نہیں۔ کیونکہ اس مادی مدنیت نے اپنی جھوٹی چمک دمک اور دلفریب زیبائش ورونق کے ذریعہ پہلے بھی بہت سے پردوں اور رکاوٹوں کا قلع قمع کر دیا ہے اور آج تمام اہلِ شرق اس بات کو سمجھ چکے ہیں کہ ان زائل شدہ رکاوٹوں کی بہت بڑی تعداد جو شخصی آزادی کے نام سے نابود ہو گئی دراصل وہ کمال بشری کے لوازم میں سے ایک لازمہ اور ضروری شے تھی۔ مگر یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کیونکہ موجودہ مدنیت اس اگلی قید و بند اور گرانبار رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑے ہونے کا نتیجہ ہے جس نے دنیا کو کئی صدیوں تک نہایت شدید مشکلوں اور تباہیوں میں پھنسائے رکھا۔ چنانچہ جب لوگوں کو اس ناگوار حالت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے بغیر اس کے کہ افراط و تفریط کے پہلو ذرا کچھ سمجھ کر اعتدال و میانہ روی کا راستہ تلاش کریں۔ جس چیز میں ذرا بھی بندش اور قید کا نام تک پایا اس سے دور بھاگنے کی کوشش شروع کر دی۔ اور تمام بندشوں کو توڑ پھینکا۔ موجودہ مدنیت کے ہر ایک طور و انداز میں ذرا سا غور و تامل بھی کیا جائے تو یہ حالت صاف صاف عیاں ہوتی ہے ہم ذیل کے چند شواہد بھی درج کرتے ہیں۔

دینی پیشواؤں نے ایک زمانہ میں اپنا رسوخ و اقتدار اس قدر بڑھا لیا۔ اور لوگوں کو اپنے جا و بے جا کام کی قیدوں میں اس طرح جکڑ لیا کہ وہ ان کے چنگل سے کسی طرح نکل ہی نہیں سکتے تھے۔ مگر مدنیت کا دور دورہ شروع ہوتے ہی اس نے دینی پیشواؤں کے ساتھ یہ نہیں کیا کہ ان کو حدِ اعتدال پر لاتی بلکہ بجائے اس کے ان دینی مقتداؤں اور دین و مذہب سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک کر بالکل

نیست و نابود کر دینے کی کوشش کی جس کی خبریں ہم کو ہر روز ملتی رہتی ہیں۔

جو لوگ انسانوں کی عقلی قوتوں کے سرچشمہ پر قابض تھے۔ انہوں نے اس قدر تنگدلی اختیار کر رکھی کہ عام آدمیوں کو اپنی دماغی ترقی اور عقلی قوتوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہی نہیں دیتے تھے مگر مدنیت کی رو آئی تو اُس نے صرف یہی نہیں کیا کہ لوگوں کو میانہ روی کے مرکز پر ٹھہرا دے۔ بلکہ اس نے ہر ایک اچھے اور بُرے انسان کے لیے آزاد خیالی مباح کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نافہم اور احمق لوگ بھی ان باتوں پر رائے زنی کرنے کے لیے تیار ہو گئے جن کے سمجھنے کی ان میں قوت نہ تھی۔ اور جو اُن کے عقل کی رسائی سے باہر تھیں۔ قدرتِ الٰہی کا انکار اور خیالی عقائد کو نہ ماننا ایک عام بات بن گئی ہے جس سے دنیا میں طرح طرح کی خرابیاں آج تک پیدا ہو رہی ہیں۔

تاریخ کے بعض ادوار میں حکام اور فرمانرواؤں نے عقل و فہم کے دائرہ سے نکل کر ظلم و ستم کے احاطہ میں قدم رکھا۔ اور خدا کی آزاد مخلوق کو اپنا غلام زر خرید بلکہ اس سے بھی بدتر تصوّر کیا تھا۔ تمدن کا دورہ آیا تو اس نے ان حکمرانوں کی تعدّی روکنے اور انہیں ان کی حد پر واپس لانے ہی کی ضرورت تک قناعت نہیں کی بلکہ حکومت کا نام تک مٹا دینے پر کمر باندھ لی۔ اور اس کے قابو سے آزاد ہونے کے لیے وحشیانہ حالت کی تقلید شروع کر دی۔ چنانچہ نہلسٹ و انارکسٹ وغیرہ مفسد اور خونخوار فرقے پیدا ہو گئے جن کی حالت محتاج بیان نہیں۔

اخلاقی معلموں اور مرشدوں نے خلافِ ادب کاموں سے روکنے میں اتنی سنگین قیدیں لگا دی تھیں جن کی وجہ سے لوگ دنیاوی کاروبار سے متنفر اور اس فانی زندگی میں زہد برتنے کے عادی ہو چکے تھے۔ مدنیت نے اس شق میں بھی اعتدال کا پہلو نہیں اختیار کیا۔ اور لوگوں کو شخصی حریت کے نام سے اجازت عام کے تاریک غار میں دھکیل دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج مدنیت کا نام لے کر ایسے جرائم کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ جن کے تصور سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور بے زبان جانور تک ان امور سے احتراز کرنا اولیٰ سمجھیں۔ عورتوں پر سختی کرنا ایک زمانہ میں اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ ان کے منہ پر آہنی قفل لگائے جاتے تھے۔ گوشت خوری اور ہنسنا تک ان کے لیے حرام قرار دیا گیا تھا۔ اور اس جنس کو بے روح سمجھا گیا۔ مدنیت کی روشنی پھیلنے ہی عورتوں کو حقوق عطا کیے جانے پر توجہ ہوئی۔ مگر کیونکر؟ اعتدال کے ساتھ؟ نہیں بلکہ اس قدر آزادی اور مطلق العنانی دی گئی جس کی وجہ

سے آج وہی عورتیں شادی بیاہ کی رسم مٹانے پر زور دیتے ہوئے بڑی بڑی کتابیں تصنیف اور شائع کرتی ہیں۔ اور چاہتی ہیں کہ ان کو اپنی نفسانی خواہشیں پوری کرنے کے لیے بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے۔ تاکہ جس طرح اور جس انداز سے وہ چاہیں زندگی بسر کریں۔

غرضیکہ اس عجیب وغریب مدنیت کی یہ حالتیں ہیں جو کہ ایک غور کرنے والے شخص کو صاف طور پر سے نظر آتی ہیں اور ہم اہل مشرق ہر ایک معاملہ میں بغیر جانے بوجھے اور پرکھنے دیکھنے کے اپنے لیے اپنی اسی مدنیت کی پیروی تصور کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات جن باتوں کے ہم اپنے حق میں یقینی طور سے مضرت رساں جانتے ہیں۔ ان کی پیروی سے بھی باز نہیں آتے حالانکہ وہ تقلید ہماری اجتماعی قوت منتشر اور ہمیں ایک سرے سے برباد کر ڈالنے والی ہوتی ہے بہرحال جب تک ہمارا یہ طرزِ عمل قائم ہے اور جس وقت تک ہم میں ایسے شیر دل اور عالی حوصلہ بلند نظر افراد نہیں پیدا ہوتے جو اس مادی مدنیت کی نمائش پر فریفتہ نہ ہو کر اپنے نیک و بد کا خیال رکھ سکیں، اس وقت تک ہمیں کوئی اچھا نتیجہ حاصل کرنے کی توقع رکھنا ع

دماغِ بیہدہ پخت وخیالِ باطل بست

کا مصداق بنتا ہے۔

جس طرح اب اکثر نوجوانوں بلکہ بوڑھوں کے چہروں سے بھی آداب وکمال کا پردہ اٹھ گیا ہے۔ اسی طرح یہ کوئی محال امر نہیں کہ مسلمان خاتونیں بھی پردہ سے باہر نکل کھڑی ہوں۔ مگر ہم تو یہی دعا کریں گے کہ خدا ایسا دن نہ دکھائے۔ بڑے بوڑھے بزرگوں سے سنا جاتا ہے کہ ان کے زمانہ شباب میں یعنی آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے جوان عمر کے لڑکے اور معزز لوگوں کے لیے قہوہ خانوں میں بیٹھنا اور تمباکو کشی کرنا معیوب امر خیال کیا جاتا تھا بلکہ اوسط درجہ کے خوش باش لوگ بھی ان امور سے پرہیز رکھتے تھے۔ لیکن آج ہماری آنکھیں یہ تماشہ دیکھتی ہیں کہ تمدن کی سب سے زیادہ حسین وخوشنما شکل یہ ہے کہ وہ بالکل آزادی و استغنا کی شان سے عام سڑکوں پر گزرتے ہوئے رہگذروں کے سامنے نظارہ گاہ خیال میں مصروف رہتے ہیں۔ یا کوئی بدچلن شخص شہر کی شارع عام پر فاحشہ اور بازاری عورت کے ساتھ

گاڑی میں سوار چلا جاتا ہے۔ مگر ایسے لوگوں کو ان خواہشوں سے روکنے کی ذرا بھی کوشش نہیں ہو سکتی۔

یہ سب خرابیاں کیوں پیدا ہوئیں؟ اس لیے کہ مدنیت کی روشنی میں خیالات کی تاریکی دفع ہونے کے ساتھ ہی شرم لحاظ کا پردہ بھی چاک ہو گیا ہے۔ اور شخصی آزادی نے کسی قانون و ادب کا ملحوظ رکھنا غیر ضروری بنا دیا۔ لیکن باوجود اس کے کہ یورپ کی مدنیت ہمارے ملک کی اخلاقی اور معاشرتی بربادی کا سبب بن رہی ہے اور ہم کو اس سے کسی طرح کا مادی نفع نہیں پہنچتا ہے ہم اس کی پیروی پر مٹے جاتے ہیں اور اسے اپنے حق میں آیۂ رحمت تصور کیے بیٹھے ہیں۔ یہ حالت دیکھتے ہوئے کچھ تعجب نہیں ہو سکتا ہے کہ شیطان ہمارے کان بھر دے اور ہم دور رفتہ کی مبارک اور پُرعافیت رسم کو چھوڑ کر اپنی سوسائٹی پر حد درجہ کی آفت نازل کر لیں۔

خدا محفوظ رکھے اس وقت وہ تمام امراض جن کو ہم اس کتاب میں بہ تفصیل لکھ آئے ہیں ہمارے جسم کو لاحق ہو جائیں گے۔ اور ہماری موجودہ بیماریوں پر اس نئے مرض کے اضافہ ہونے سے قومی جسم ایسا سراپا آزار بن جائے گا۔ جس کی خطرناک حالت بیان کرنے کی ہمیں کسی طرح جرأت ہی نہیں ہوتی۔

خدا کا شکر ہے۔ کہ اس نے مسلمان کو مایوس ہونے والا انسان نہیں بنایا ہے یہ ایک ایسی شریف عادت ہے جو اسلام کی قوی روح نے اس کی سرشت میں داخل کر دی ہے۔ اور اس کی وجہ سے ایک خاص قسم کی اخلاقی جرأت اور غیرت مسلمانوں کے دلوں میں سمائی ہوئی ہے۔ اور یہ امر ان کا امتیازی نشان بن گیا ہے۔ اس لیے مجھ کو توقع ہے کہ یورپین مدنیت کا بلاخیز سیلاب ہماری طبیعتوں میں جن نئی بدعتوں کا مسکن بناتا ہے۔ ایک نہ ایک دن ضرور ہے کہ ان کی کش مکش سے ہماری وہ غیرت مندی جوش میں آئے گی اور ہم کو پھر اسی اوجِ کمال کی طرف لے چلے گی۔ جس کے سایۂ رحمت نے ہمارے آبائے کرام اور سلف صالحین کو اپنے دامنِ عاطفت میں پناہ دے کر مصدر برکات بنا دیا تھا۔ اور ہم اس مستعار بوسیدہ لباس کو اتار کر اور نفسانی خواہشات کی رہنمائی سے اختیار کی ہوئی بدعتوں پر لات مار

کر اپنے اسی کمالِ فطرت انسانی کی طرف دوڑیں گے جس کا مقتضیٰ عورتوں اور پردہ کے بارہ میں سراسر عدل اور میانہ روی کی شاہراہ پر چلنا ہے اور جس طرح ہم وہ پہلی قوم تھے جس نے دنیا کو راہِ راست کے نشان دکھائے۔ ویسے ہی ہم ہی وہ آخری قوم ثابت ہوں گے جس نے کمال انسانی کی محافظت اور بچاؤ میں مردانہ ہمت سے کام لیا ہو۔

وہی پوری عورت ہے جو مادی تمدن کی پابند ہو؟

جتنی باتیں ہم اوپر بیان کر آئے ہیں ان پر ایک معمولی نظر ڈالنے کے بعد ہر شخص بخوبی معلوم کرے گا کہ خود اس مادی مدنیت کے سربرآوردہ اشخاص اب تک اپنے بیان کی کاملہ عورت کے نہ پائے جانے کا صاف صاف اقرار کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ جن معاشرتی حالات کے گرد اب تک وہ گھری ہوئی ہیں ان سے علاوہ اس کے کہ عورت ابھی تک منتظرہ کمال کے درجہ پر نہیں پہنچ سکی! بڑی خرابی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ عورت نے اپنے قدرتی فرائض کو چھوڑ کر ایک ایسا جداگانہ طریقہ اختیار کیا ہے جو پاکیزہ زندگی کے [illegible] اور اسرارِ کائنات کے بالکل منافی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر ہم بھی ان لوگوں کی طرح ہوتے جو نمائشوں پر مفتون ہو جایا کرتے ہیں اور اصل حقیقت کے انکشاف کی پرواہ نہیں کرتے تو ضرور تھا کہ ہم سب سے پہلے مسلمان خاتون کے لیے یورپین عورت کے قدم بہ قدم پیروی کرنے کا حکم دیتے لیکن ہم نے اس موضوع پر ایک حرف تک لکھنے سے قبل علم اور اسرارِ کائنات کی نگاہوں سے مسئلہ کی حقیقی واقعیت پر غور کر کے دیکھ لیا تھا کہ انسانی زندگی میں عورت کے لیے ایک خاص شان اس شان کے علاوہ اور بھی ہے جو اسے سر دست حاصل ہے۔ پھر ہم نے یہ دیکھا کہ مسئلہ نسواں کے بارہ میں تمدن یورپ کے بانی مبانی اصحاب نے کیا کچھ لکھا ہے۔ تو ہمیں معلوم ہوا کہ وہ بھی ہمارے ہی ہم صفیر اور اس عظیم الشان حقیقت کے بالاعلان تسلیم کرنے والے ہیں وہ بھی اپنی پوری طاقت اس بات پر صرف کر رہے ہیں کہ جس طرح ممکن ہو بند ریج ان تمام بیماریوں کو مٹا رہی ہیں جو عورتوں کے قدرتی فرائض کے بخوبی ادا کرنے میں خارج و مانع بن رہی ہیں۔ ہم نے جس قدر ان لوگوں کے اقوال نقل کیے ہیں وہ اس بارہ میں کافی ہوں گے کہ ناظرین اس مسئلہ کے متعلق نمائشی چشم دید حالات اور سُنے سنائے تعریفی بیانات کے خلاف حقیقت

ہونے پر ہمارے ہم خیال بن سکیں۔ ورنہ اگر ہم اپنی رائے کی جنبہ داری میں خود ان گھر والوں کو جو اپنے حالات سے بخوبی واقف ہیں جھوٹا قرار دیں، تو لامحالہ ہمیں اس غلطی کا سخت رنج وہ خمیازہ بھی بھگتنا ہوگا۔

علاوہ بریں یہ مسئلہ فی الحقیقت بھی نہایت سیدھا سادہ ہے۔ اور اس قابل نہیں ہے کہ اس کا لب لباب معلوم کرنے کے لیے کسی سخت دماغی محنت اور غور و فکر کرنے کی زحمت گوارا کرنی پڑے کائنات کے احوال اور مراتب میں معمولی غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہ نے ہر ایک مخلوق کو اس کے ضروریاتِ معاش اور ادائے فرائض خاص کے مناسب حال اعضاء اور قابلیتیں عطا فرمائی ہیں تاکہ وہ اپنا قدرتی کمال بخوبی حاصل کر سکے۔ لیکن اس کے ساتھ کسی وقت وہ مخلوق اپنے دائرے سے باہر بھی نکل سکتی ہے اور اپنے وظیفۂ فطری کے سوا دوسرے کام بھی انجام دے سکتی ہے۔ اس صورت میں بہ مقتضائے کُلُّ جَدِیۡدٍ لَذِیۡذٌ اس کی حالت کچھ دیر کے لیے دل پسند ہوتی ہے جس کی وجہ سے کچھ یہ نہیں کہ وہ مخلوق اس پسندیدگی کی اہل ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ ہر ایک نئی بات کا خوش آئند ہونا تقاضائے فطری ہے۔ مگر جب کچھ عرصہ تک وہ حالت پیشِ نظر رہے۔ اور یہ معلوم ہو جائے کہ اس طریقہ پر وہ مخلوق اپنی ترکیب و فطرت کے احکام سے خلاف ورزی کر رہی ہے تو اب بجائے پسندیدگی کے اس کی یہی حالت مکروہ اور بدنام معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور وہ تمام خرابیاں جو پہلے پہل اس تغیر حالت میں پائی گئی تھیں مجسم عیوب و نقائص نظر آنے لگتی ہیں۔ مثلاً آج ہم جس وقت یہ سنتے ہیں کہ ہماری سوسائٹی میں کوئی عورت اعلیٰ درجہ کی پولٹیکل قابلیت سے بہرہ ور ہوئی ہے تو ہمارا دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اور ہم بے اختیار اس نئی عورت کی تعریفیں کر کے اسے عالم نسواں میں کمالِ نسوانی کی مثال تصور کرتے اور اخبارات میں اس کے لیکچر اور مضامین پڑھ کر اتراتے پھرتے ہیں۔ لیکن جب اس کے بعد اور بھی بہت سی پولٹیکل معاملات میں دخل دینے والی عورتیں علم طبیعات کی ماہرہ علم ہیئات اور انجینیری میں مہارت رکھنے والی مستورات پیدا ہو جائیں اور حادثاتِ طبعی اپنی زبانِ حال سے ہم کو یہ خبر دیں کہ اس نئی بدعت سے ہم پر کوئی تازہ آفت آنے والی ہے تو فوراً ہی ہمارے افکار کا رُخ بدل جائے گا اور ہم ان مرد بننے والی عورتوں سے ناراض ہو کر کسی طرح ان کی یہ حالت دیکھنی پسند نہ کریں گے، مگر اس وقت تاسف کرنے سے ہم کو فائدہ کیا

ہو گا؟ کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ حالات کی افتاد نے اب ہمیں سوسائٹی اور معاشرت کی ایک جدید شکل میں داخل کر دیا ہو گا۔ اور ہم اپنے آپ کو دو خطرناک موجوں کے جائے اتصال پر کھڑے ہوئے دیکھیں گے۔ اگر ہم عورتوں کو اس حالت سے باز رکھنے کی کوشش کریں گے تو بوجہ اس کے کہ ہماری اس قوت کی تمدنی حالت موجودہ حالت سے بہت کچھ بدل گئی ہو گی۔ اور ہم ترقی یافتہ جنس نسواں کو چھیڑ کر آفت بالائے آفت برپا کریں گے۔ اور اگر ہم نے عورتوں کو ان کی حالت پر چھوڑ کر جس طریقہ پر وہ چل رہی ہیں چلنے دیا تو اس کا انجام یہ ہو گا کہ مرض لاعلاج ہو جائے گا۔ اور ہمیں بھی وہی شکایتیں پیدا ہوں گی جو یورپین اقوام کے علماء کو پیدا ہو رہی ہیں۔ اور جن کی فریادوں کا کچھ نمونہ ہم اپنی اس کتاب میں دکھا بھی چکے ہیں۔

ہماری اور اہلِ یورپ کی موجودہ حالت کی تمثیل دینے کے لیے اسی بات کا پیش کر دینا بالکل صحیح اور درست ہے کہ ہم جس وقت یہ سنتے ہیں کہ یورپ میں انجنیری، ڈاکٹری اور سیاسی امور میں عورتیں برابر حصہ لے رہی ہیں۔ پس ہم وفورِ حیرت و مسرت سے مدہوش ہو کر اپنی ہستی پر غور کرنا بھول جاتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ ہم آئندہ پیش آنے والے وقتوں پر ذرا بھی غور نہیں کرتے۔ اور اس پر تیار ہو جاتے ہیں کہ جس طرح یورپ میں عورتیں علم و کمال کی معراج پر چڑھ رہی ہیں۔ ہماری عورتیں بھی اسی طرح علمی اور اخلاقی ترقیوں کے زینے طے کرنے لگیں اور پھر ہم میں سے جو شخص اس تحریک کو روکنا چاہے اس پر متعصب، وہم پرست اور موروثی آبائی تقلید اور ضعیف الاعتقادی و تنگ خیالی کا الزام لگا کر اُسے بُرا بھلا کہنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں اور اگر ہم ان سے یہ کہیں کہ صاحبو! جن یورپین لوگوں کی حالت کو تم تقلید اُپیش کرتے ہو وہ خود ہی ان ڈاکٹر، انجنیر اور نلاسفر عورتوں کے وجود سے تنگ آ گئے ہیں۔ اب انہیں عورتوں کے یہ القاب مطلقاً پسند نہیں آتے اور ان پر احکام فطرت کی خلاف ورزی سے آخر کار مصیبت آنے کا حال کھل گیا ہے، جس کی وجہ سے وہ برابر اس کی مخالفت پر قلم اور زبان سے کام لے کر اپنی قوم کو آئندہ اور موجودہ خرابیاں دکھا کر ڈراتے اور سمجھاتے ہیں کہ جس قدر ممکن ہو سکے اس حالت کو بدلنے کی سعی کریں۔ لیکن ہمارے روشن خیال احباب اس بات کو مناظرہ میں مغالطہ دینا تصور کرتے اور کسی کی نصیحت ماننے پر تیار نہیں ہوتے ہیں۔ وہ یورپین عورتوں کی کامیابی کے قصے سُن کر اور ان کا کاروباری زندگی

میں حصہ لینا معلوم کر کے ایسے از خود رفتہ ہو رہے ہیں کہ اندیشۂ انجام اور عقل سلیم کی ہدایتوں کو اپنے پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتے۔

لیکن کیا کیا جائے؟ یہ ایک قانونِ قدرت ہے۔ یا یوں کہو کہ ایک تمدنی فتنہ و آفت ہے جو زور آور قوموں کی طرف سے مغلوب اور کمزور قوموں پہ سحر و افسون سے بھی بڑھ کر اثر انداز ہوتا ہے یہاں تک کہ آج اہلِ ایشیا کی بہت سی عادتیں ایسی ہیں جو محض یورپ کی تقلیدی ہیں۔ اور اگر ان مقلدوں سے ان عادات کا مفہوم اور ان کے تقلید کی وجہ دریافت کی جائے تو وہ کچھ جواب ہی نہیں دے سکتے۔ ایک معمولی سی مثال یہ ہے کہ ہر وقت لوگ ایک دوسرے کو سلام کرتے ہوئے غیر زبانوں کے ہی سلام استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ اس زبان کا ایک حرف بھی نہیں جانتے اور نہ اس کا عمدہ طور سے تلفظ کر سکتے ہیں۔ یہ تو ہر ایک پسماندہ قوم کے افراد کی حالت ہے۔ مگر ان کے خاص افراد کو لازم ہے کہ وہ اس پستی کے گڑھے میں گرنے سے اپنے تئیں بچائیں۔ اور اپنے آپ کو ایسی قابلِ تقلید مثال اور رہنمائی کا نشان بنائیں۔ جن کو دیکھ کر قوم کے بھولے بھٹکے افراد اور راست پہ پہنچ سکیں اور فتنۂ ایام کی لپیٹ میں آنے سے بچنے کے لیے ان کے زیرِ سایہ پناہ لیں۔

کتاب المراۃ الجدیدہ کے مولف نے رسم پردہ پہ حملہ کرنے اور اس کی برائیاں دکھلانے میں بخیالِ خود ایشیائی ممالک کی عورتوں کی خراب حالت اور کثرتِ طلاق کی پُر زور دلیلیں پیش کی ہیں اور پھر پردہ کو ان تمام آفتوں کی جڑ اور جملہ خرابیوں کا سر چشمہ قرار دے کر اس کے اٹھا دینے کی صلاح دی ہے مگر ہم کہتے ہیں کہ ان کی تمام دلیلیں نامقبول ہیں۔ ہمارا قول ہے کہ پردہ ہی ایک ایسی چیز ہے جس نے عورتوں کو موجودہ حالت سے ہزار درجہ بڑھ کر خراب حالت میں مبتلا ہونے سے بچائے رکھا ورنہ نہیں معلوم ان کا آج کیا حشر ہوا ہوتا۔ اس لیے جب کہ جاہل اور حقیر عورت کے حق میں پردہ بہت سے مہلک اجتماعی امراض سے محفوظ رکھنے کا ذریعہ اور بہت سی آفتوں سے ان کا محافظ ہے تو ضرور ہے کہ جس وقت عورت علم و لیاقت کے زیور سے آراستہ ہو گی۔ خواہ وہ اوسط ہی درجہ کی تعلیم کیوں نہ پائے۔ اس وقت بھی پردہ اسے اپنے وظیفۂ طبعی کی مسندِ عزت پہ بٹھانے اور اسے اپنا اصلی کمال حاصل کرنے کی ہدایت کرنے کے لیے سب سے بڑھ کر کارآمد ذریعہ اور راہنما ہو گا۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قدر حیرت کیوں ہے؟ کیا دنیا اور اس کے حوادث اس بات کے شاہد عادل نہیں کہ اگر عورتوں کو پردہ کی طرف منسوب کی جانے والی خرابیوں سے بچانے میں صرف بے نقابی اور بے پردہ پھرنا ہی سب سے بڑھا ہوا اور یکتا محافظ مانا جاتا ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ یورپین ممالک میں بھی یہ تمام علتیں زور شور کے ساتھ موجود ہیں؟ اور کیوں وہاں ان باتوں کی اتنی کمی نہیں پائی جاتی جو قابلِ ذکر بھی نہ ہو حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے کیونکہ جس شخص کو حالاتِ عالم پر اطلاع حاصل ہے۔ اُسے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو آزادی دلانے والے حضرات جن خرابیوں کا رونا روتے ہیں۔ وہ خرابیاں بجنسہٖ اس مادی مدنیت میں بھی موجود ہیں۔

تنگدستی اور تباہ حالی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو خود کتاب مراۃ الجدیدہ کے مؤلف کی شہادت سے پتہ چلتا ہے کہ یورپین مدنیت میں یہ حالت بہ نسبت ہمارے ملک کے بدرجہا سخت تر پائی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ مردم شماری کی آخری رپورٹوں کی رو سے ملک مصر میں ۱۳۱۷۶۲ کاروبار اور مزدوری کرنے والی عورتیں ہیں لیکن اس کے بالمقابل فرانس میں پانچ ملین سے زائد عورتیں اپنی روٹی ذاتی محنت مزدوری سے پیدا کرنے پر مجبور ہیں۔ اب اگر ان دونوں مقاموں کی مردم شماری کا تناسب دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ فرانس میں فی صدی ۱۴ اور مصر میں فی صدی ½ عورتیں محنت مزدوری کرنے والی پائی جاتی ہیں جو اس بات کی مخصوص دلیل ہے کہ مدنیت کے سب سے اپنے ملک میں بھی بہ نسبت ہمارے ملک مصر کی عورتوں پہ فاقہ زدگی کی بڑھتی ہوئی آفت نازل ہے۔ لیکن فاضل مؤلف نے اس بات کو تحریر کرنے کے بعد یہ بھی لکھ دیا ہے کہ :-

ان عورتوں کے محنت مزدوری اور کاروبار کرنے سے ان کے گھرانوں پر کوئی اثر بد نہیں ہوا ہے۔

سبحان اللہ! مؤلف کا یہ قول بدیہی محسوس حالات کے بالکل خلاف اور خود علمائے یورپ کے اقوال سے برعکس ہے۔ ہمارا فرض ہونا چاہیئے کہ جب ایسے مسئلہ پر اختلاف رائے کا موقع پیش آئے تو اپنی رائے قائم کرنے سے پہلے خود اسی گھر کے رہنے والوں اور علمِ اقتصاد کے ماہر استادوں کے اقوال سے مستفید ہوں۔ کیونکہ وہ لوگ اپنی حالت سے خوب واقف ہیں اور اس کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف ہیں۔ مشہور اقتصادی فلاسفر "جول سیمان" جو انیسویں صدی کا مدبر

دہرایا گیا ہے۔ وہ تو خاص سرزمین یورپ میں چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ کارخانوں اور فیکٹریوں نے عورت کو اس کے گھرانے سے نکال لیا ہے۔ اور منزلی زندگی کے اصول کو توڑ کر پارہ پارہ کر ڈالا ہے۔ مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ عورتوں کے کاروباری خارجی زندگی میں شریک ہونے سے ان کی منزلی زندگی پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑا! ہم دیکھتے ہیں کہ اکیلا "جول سیمان" ہی اس حقیقت کا ادراک کرنے والا نہیں پایا جاتا۔ بلکہ بلا استثناء تمام علمائے عمران اور تمدن اسی کے ہم سفر اور ہم خیال ہیں چنانچہ مزید استدلال اور مخالفین کو قائل بنانے کے واسطے ہم ذیل میں انگریزی علامہ "سامویل سمائیلس" کا وہ قول بھی نقل کیے دیتے ہیں جو اس نے اپنی کتاب الاخلاق میں لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

جو دستور عورتوں کو دخانی کارخانوں میں کام کرنے کی اجازت دیتا ہے اس سے خواہ ملکی ثروت کتنی ہی کیوں نہ ترقی کر جائے لیکن اس میں شک نہیں کہ اس نظام کا نتیجہ حیاتِ منزلی کی بنیادیں متزلزل کر دینے والا ثابت ہوا ہے وہ خانہ داری کے طرزِ زندگی پر حملہ آور ہوا ہے۔ اور اس نے گھرانے اور کنبے کی شاندار عمارت کو منہدم کر کے معاشرت کی بندشیں بالکل توڑ پھینکی ہیں۔ اس حالت نے بیوی کو شوہر اور اولاد کو ان کے رشتہ داروں سے چھین کر ایک ایسی خاص نوعیت اختیار کر لی ہے جس کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ عورت کی اخلاقی حالت ابتر ہو جائے۔ کیونکہ عورت کا حقیقی وظیفہ واجباتِ منزلی کو ادا کرنا تھا۔ اپنے مکان، رہائش کی ترتیب و آراستگی، اپنے بچوں کی تربیت اور خانگی ضرورتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے وسائلِ معیشت میں انتظام و کفایت شعاری برتنا۔ مگر کارخانوں نے عورت کو ان تمام واجبات سے الگ کر دیا ہے۔ اب گھر، گھر نہیں رہ گئے۔ اولاد کو تربیت نہیں ملتی۔ وہ لاپرواہی کے عالم میں پڑی رہتی ہے زناشوئی کی آتشِ محبت سرد ہو گئی عورت کی وہ حالت نہیں رہ گئی کہ وہ ایک خوش مزاج بیوی اور مرد کی محبوب مانی جائے۔ بلکہ اب وہ محنت و مشقت برداشت کرنے میں مرد کی مدمقابل اور حریف بن گئی ہے۔ اسے اس قسم کی تاثیرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو اکثر حالتوں میں دماغی اور اخلاقی فروتنی کو محو کر دیتی ہیں۔ وہ دماغی و اخلاقی تواضع جس پر فضیلت کی حفاظت کا دارومدار تھا۔

اس عبارت کو پڑھ کر کیا شک رہ جاتا ہے کہ جانگداز تنگدستی اور قابلِ رحم حالت یورپین عورتوں میں مشرقی ممالک کی عورتوں سے اس قدر زیادہ پائی جاتی ہے جس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ عورتیں منزلی دائرہ سے نکل کر خارجی کاموں میں معروف ہونے کی وجہ سے نہایت المناک اور ناگفتنی حالت میں مبتلا ہو رہی ہیں جس کا پتہ علمائے یورپ ہی کی تحریروں سے چلتا ہے اور ہمیں اس بات کا کوئی حق نہیں کہ ہم خود گھر کے مالکوں کو اپنے گھر کے بارہ میں غلط بیانی کرنے والا تصور کریں۔ اس لیے اگر پردہ نہ کرنا عورتوں کی خوشحالی یا کم از کم ان کی مصیبتوں کا ہلکا بنانے والا امر ہوتا تو یورپ کی عورتوں پہ ایسی آفت ہرگز نہ آتی جسے ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔

اب کثرتِ طلاق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو آج جو ملک مدنیت اور خوشحالی کے اعتبار سے دنیا میں بڑھا ہوا ہے۔ اس میں یہ خطرناک علت بھی اس قدر حد سے بڑھ گئی ہے کہ وہاں کے علماء اور روشن دماغ فلاسفر اسے دیکھ دیکھ کر بے چین ہوتے اور اس کے روکنے کی کوئی تدبیر نہیں کرسکتے ہیں۔ فرانس کے رسالہ ریویو آف ریویوز جلد ۲۵ میں ایڈیٹر کے حسبِ خواہش مشہور امریکن مضمون نگار اور اہل قلم "لوسن" نے ایک نقشہ ان طلاقوں کے شمار و اعداد کا شائع کیا تھا جو ممالک امریکہ میں روز بروز کثرت سے واقع ہوتے جاتے ہیں۔

اس جدول کے ملاحظہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مملکت "مساشوزیت" میں صرف ایک سال ۱۸۹۴ء میں ۶۲۲ طلاق کی درخواستیں گذریں، حالانکہ اس سے قبل جو سال گزرا ہے اس میں ۷۷۰ طلاق واقع ہوئے تھے۔ اس سے یہ ثابت ہوا ہے کہ طلاق کی تعداد بہت تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور اسی ملک میں ۱۸۸۰ء میں ہر ایک ۱۰۵ شخصوں میں ایک شادی ہوتی تھی۔ مگر ۱۸۹۴ء میں ۱۲۲ شخصوں میں سے ایک شادی کا اوسط نکلتا ہے جس سے شادی شدہ لوگوں کی کمی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

ملک اہیئو (امریکہ) میں بھی شمار و اعداد کی یہی افسوسناک حالت مشاہدہ کی جاتی ہے جہاں ۱۸۶۵ء میں یعنی ۳۵ سال پہلے ۲۲۱۹۸ شادیاں درج رجسٹر ہوئیں جن میں ۸۳۷ طلاق واقع ہوئے۔ یعنی تقریباً ہر ۲۶½ شخصوں کے مقابلہ میں ایک طلاق ہوا لیکن ۱۸۹۴ء میں ۲۲۸۵۸ شادیاں درجِ رجسٹر ہوئیں اور طلاق کی تعداد ۳۵۷۳ یعنی فی ۱۲½ شادیوں میں صرف ایک

طلاق واقع ہوئی۔

اور مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اس ملک میں صرف دس سال کے اندر طلاق کی تعداد اس کی اوسط سے بہ مقدار ۱۰۰۰ اکے بڑھ گئی اور شادیوں کی تعداد اپنے اوسط سے بہ مقدار ۸۴۸۹ ۸ گھٹ چلی۔ مضمون نگار نے ان شمار و اعداد کے بعد لکھا ہے کہ :۔

اگر امریکن عورت کی زندگی جدید طوفانی موجوں کے تھپیڑوں میں نہ پڑ گئی ہوتی تو اس میں شک نہیں تھا کہ اس وقت ملک" امیہ" میں ۹۴۲۵۶ گھرانوں سے کم گھرانے نہ ہوتے۔

کیلیفورنیا میں جو ممالک متحدہ امریکہ کا ایک ملک ہے ۱۸۹۶ء میں دو ہزار شادیاں ہوئیں۔ اور ان میں ۷۴۱ طلاق واقع ہوئے۔ یعنی ہر تین شادیوں میں سے ایک کا انجام طلاق نکلا۔

غرضکہ ریویو آف ریویوز کی مذکورہ بالا جلد میں "لوسن" نے جو سرکاری رپورٹ طلاق کے شمار و اعداد کے متعلق درج کی ہے۔ اس سے اکثر ولایات ممالکِ متحدہ میں واقع ہونے والے طلاقوں کا شمار معلوم ہو سکتا ہے۔ اور وہ حسب ذیل ہے۔

مملکت کونیکورٹ میں	فی دس شادیوں میں ایک طلاق
" مساشوزیت میں	" اکیس " " " "
" روسلان میں	" تیرہ " " " "
" شکاگو میں	" آٹھ " " " "

اور شمار و اعداد کی رپورٹوں سے واضح ہوا ہے کہ شکاگو کا محکمہ ہر سال ۳۵۰ طلاق درج رجسٹر کیا کرتا ہے۔ حالانکہ وہاں کے باشندوں کا شمار ۲۰۰۰۰۰ سے زائد نہیں، ان امور کو ذکر کرنے کے بعد خود "لوسن" لکھتا ہے :۔

خلاصہ یہ ہے کہ اب طلاق کا رواج حد سے بڑھ گیا ہے اور جو امر سخت خوفناک ہے وہ یہ ہے کہ ۸۰ فی صدی طلاق کی درخواستیں عورتوں کی جانب سے پیش ہوتی ہیں اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرد کو نسخ زواج (نکاح) کا بہت کم خیال گذرتا ہے کیونکہ

وہ اپنی عورت کو طلاق دینے سے بے حد شرمندہ ہو جاتا ہے۔ اور اس لیے جس وقت مرد اپنی بیوی کے ہاتھوں سے تنگ آ جائے تو پہلے وہ کسی دوسری عورت کی تلاش کرتا ہے۔ اور جب تک دوسری مطلوبہ اس سے شادی کرنے پر رضامندی نہ ظاہر کرے وہ ہرگز پہلی بیوی سے علیحدگی اختیار کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔

اس فاضل مضمون نگار نے امریکہ میں طلاق کے ایک بالکل آسان امر ہونے کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:۔

اور بہت سے شوہروں کو اپنی عورتوں کے ان سے طلاق حاصل کر لینے کی خبر ہی اس وقت ملتی ہے۔ جب کہ وہ عورتیں دوسرے مرد سے شادی کر چکی ہوتی ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ طلاق کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ لبسا اوقات ان کا باعث یہ ہوتا ہے کہ مرد اپنی بیوی کا نان و نفقہ ادا نہیں کرتے اور انہیں مجبوری کے عالم میں تنہا چھوڑ دیتے ہیں چنانچہ مسٹر "لوسن" لکھتا ہے:۔

پارسال یعنی ۱۸۹۷ء میں بمقام "بوسٹن" عدالت عالیہ کا افتتاح ہونے پر برابر تین دن تک عدالت میں مردوں اور عورتوں کا ایک ہجوم لگا رہتا تھا جو سب کے سب طلاق کے طلب گار تھے۔ لہٰذا پہلے ہی ہفتہ میں ۷۵ طلاق جاری ہوئے اور بالعموم طلاق کا یہی سبب پایا گیا۔ کہ مردوں نے اپنی بیویوں کو چھوڑ دیا تھا

غرضیکہ یہ شمار و اعداد اور یہ ناگوار شکایتیں صاف بتا رہی ہیں کہ جس علت کا رونا کتاب المراۃ الجدیدہ کے فاضل مؤلف روتے ہیں۔ وہ مدنیت و ترقی کے سب سے عظیم الشان ملک میں بھی موجود ہے۔ اور اگر اس کا باعث پردہ ہوتا تو ضرور تھا کہ وہاں اس خوفناک درجہ تک یہ صورت نظر نہ آتی رہتا۔ ہمارا یہ کہنا کسی قدر حیرت انگیز ہوگا کہ ممالک امریکہ میں طلاق کے واقعات ناگوار اور خوفناک حالت تک پہنچ گئے ہیں۔ لیکن ہم نے اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں کیا ہے کیونکہ خود وہاں کے رہنے والے اور گھر کے بھیدی لوگ یہی کہتے ہیں جیسا کہ ریویو آف ریویوز میں مذکورہ بالا شمار و اعداد کا اندراج کرنے کے بعد یہ عبارت تحریر کی گئی ہے:۔

بہر حال اب سوسائٹی اور معاشرت کی چادر میں آگ لگ گئی ہے مگر نہ صرف اس کے دونوں کناروں ہی میں آگ لگی ہے بلکہ یار لوگ اسے وسط سے بھی جلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ گھریلو زندگی کو منہدم کرنے میں نئے زمانہ کی عورت ہی کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ ہم اوپر لکھ آئے ہیں اسے ایک سرسری نگاہ سے دیکھ لینے کے بعد ہمیں لامحالہ یہی مان لینا پڑے گا۔ کہ جن امور کی شکایت کی جاتی ہے۔ ان کے زائل کرنے کے واسطے صرف تھوڑی سی تہذیب کی ہمیں ضرورت ہے۔ جس کے ساتھ ہی پردہ کا دوام وقیام بھی لازم ہے کیونکہ یہی پردہ عورت کے استقلال کا یکتا ضامن اور اس بات کا واحد کفیل ہے کہ مرد عورت کو اس کے موجب سعادت حدود طبعی سے باہر نہیں نکال سکتا۔ ورنہ جہاں عورت نے حدود طبعی کے دائرہ سے قدم باہر رکھا فوراً اس کے کمال کو زوال لاحق ہو گا۔ اور وہ تباہی و ہلاکت کے غار میں جا گرے گی۔ جس کو ہم تمدنی اصول سے واضح طور پر ثابت کر چکے ہیں۔ اس لیے ترتیب سے یہاں تک کہ بالکل سادہ اور معمولی تربیت سے بھی ماں بننے والی عورتوں کی جہالت دور ہو سکتی ہے۔ اور وہ اپنے گھروں کی حالت درست رکھنے اور اپنے شوہروں کو خوش رکھنے کے لائق بن سکتی ہیں۔

اسی بسیط تربیت کے ذریعہ سے تمام خرابیوں اور برائیوں کی جڑ کٹ جائے گی۔ یا وہ اس قدر کم ہو جائیں گی کہ گویا باقی ہی نہیں رہیں۔ پھر گھر کی حالت سدھر جانی یقینی بات ہے۔ اور اس کا ایسی سعادت و مسرت کا مخزن بن جانا لازمی ہے۔ جس کی وجہ سے گھر کے رہنے والے پُرلطف زندگی بسر کرنے ہوں گے۔ ہمارے اس دعوے کی ایک محسوس دلیل یہ ہے کہ ہماری قوم کے اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ طبقوں میں اس قسم کی علتیں اور خرابیاں شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہیں۔ حالانکہ اسی کے بالمقابل ہم دیکھتے ہیں کہ مادی مدنیت کے ممالک میں زناشوئی کے تعلقات روز بروز خلل پذیر اور خوفناک برہمی کی صورت میں جلوہ گر ہوتے جاتے ہیں جس کی شہادت مذکورہ سابق شمار و اعداد اور بہت سی باتوں سے بھی بہم پہنچتی ہے۔ مگر ہم بخوفِ طوالت یہاں اس سے زیادہ تحریر نہیں کرتے۔ اور یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ یورپین ممالک کے طلاق دینے والے مرد یا طلاق لینے والی عورتیں بہ نسبت ہمارے ان طبقوں کے جن میں طلاق کی واردات شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ علم و تہذیب کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز

ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر ہمارے یہاں عورتوں کی جہالت اور بد تہذیبی کثرتِ طلاق کی موجب مانی جائے تو تعلیم یافتہ یورپین عورتوں میں اس ناپسندیدہ امر کا اتنا خوفناک شیوع کیوں پایا جاتا ہے؟ اور یہی سرسری نظر اس بات پر دلالت کرنے کے لیے کافی ہے کہ کثرتِ طلاق اور منزلی جھگڑوں کے موجب جہالت اور پردہ کے نقصانات کے علاوہ کچھ اور ہی اسباب ہیں۔

پھر اگر ہمارے یہاں مرد عورتوں کو اس لیے بے نان و نفقہ چھوڑ دیتے ہیں کہ ان کی نگاہوں میں عورتوں کی کوئی عزت و وقعت نہیں تو ضروری تھا کہ یہ آفت مادی مدنیت والوں میں بالکل نہ ہوتی اس لیے کہ ان میں اس کا سبب زائل ہو چکا ہے۔ وہ لوگ بالعموم عورتوں کی عزت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جس قدر مدارات اور پاس و لحاظ ہم عورتوں کا کرتے ہیں، مشرقی قوموں میں اس کا ذرہ بھی اثر نہیں پایا جاتا۔ ہم نے مانا کہ ان کا دعویٰ صحیح ہے لیکن اس کی وجہ کیا قرار دی جائے کہ شمار و اعداد سے طلاق کی زیادہ تر بلکہ عام درخواستیں اسی شکایت کی بنیاد پر گزرتی ہیں کہ مردوں نے عورتوں کو روٹی کپڑا نہیں دیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ عورتوں کو حقیر و ذلیل تصور کرتے ہیں تو درست نہیں۔ کیونکہ ان کا دعویٰ اس کے برعکس ہے یعنی وہ عورتوں کی خاطرداری میں اپنی جان تک فدا کر دینے کے مدعی ہیں۔ اور اگر ان کو نامہذب اور جاہل خیال کیا جائے تو یہ بھی سراسر غلطی ہے۔ کیونکہ یورپ کا کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا جسے کم از کم لکھنا پڑھنا نہ آتا ہو۔ اس لیے ماننا پڑے گا کہ اس معلول کی اور ہی علت ہے۔

آزادیٔ نسواں کے طلبگار بہت زور دے کر کہتے ہیں کہ پردہ اس بات میں سخت بارج ہوتا ہے کہ مرد اپنے مناسبِ حال عورت کو تلاش کر سکے اور اسی پردہ کے باعث مرد کو اس بات کا موقع نہیں ملتا کہ وہ شادی سے قبل اپنی بیوی کے عادات و اطوار سے واقفیت حاصل کرے اور اس بات کا اندازہ کر سکے کہ آیا وہ عورت کے ساتھ شادی کرنے کے بعد پُرلطف زندگی بسر کر سکتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ اسی علت کو کثرتِ طلاق کی بنیاد بھی قرار دیتے ہیں ہم کہتے ہیں کہ اول تو ہمارے اعلیٰ طبقوں اور اوسط درجہ کے روشن خیال طبقوں میں طلاق کی وارداتیں یوں ہی بہر شاذ و نادر وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ بلکہ بالکل نہیں ہوتیں۔ اس لیے اگر طلاق کا سبب یہی ہوتا کہ مرد کو شادی کرنے سے پہلے عورت کے اخلاق و عادات کا پردہ کی قید و بند کی وجہ سے تجربہ نہیں

ہو سکتا ہے تو ضروری تھا کہ ان دونوں طبقوں میں بھی کثرت سے طلاق دیئے جاتے جیسے عام اور ادنیٰ درجے کے لوگوں میں واقع ہوتے ہیں۔ مگر یہاں تو معاملہ اس کے برعکس دیکھا جاتا ہے۔

دوم یہ کہ اگر شادی سے پہلے مرد کا عورت کی طبیعت سے پوری طرح واقف ہو جانا اور اس کے مزاج کا تجربہ کر لینا عدم طلاق کے لیے کفیل بن سکتا تو یورپین مدنیت کے رہنے والے جو پردہ کی قید سے آزاد اور خوش قسمتی سے اس نعمت کو حاصل کر چکے ہیں ان کے ہاں کیوں اس کثرت سے طلاق کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں جن کو دیکھ کر ان کے دانشمند افراد سخت پریشان ہوتے اور خیال کرتے ہیں کہ اس طرزِ عمل سے ان پر ایک نہ ایک دن عظیم الشان تباہی آنے والی ہے۔

سوم جب کہ وہ شادی جو باہمی محبت بلکہ عشق کے ذریعے سے ہوئی ہو، عقدِ زوجیت کے قائم و باقی رہنے کی واحد ضامن قرار دی جاتی ہے۔ اور ایسی محبت و الفت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جس وقت پردہ کی قید و بند نہ ہو۔ تو یورپ والوں کو یہ نعمت بھی بخوبی حاصل ہے۔ چنانچہ ان میں کوئی ایک شادی بھی اُصولِ کورٹ شپ کے خلاف نہیں ہونے پاتی۔ پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں اس درجہ تک طلاق کی کثرت کیوں دیکھی جاتی ہے۔

جو شخص اس مسئلہ پر تحقیق کی باریک بین نظر ڈالنا چاہے اسے لازم ہے کہ مذکورۂ بالا اُبھرے ہوئے اور نمایاں نقطوں کو اپنا نصب العین بنا لے۔ تاکہ اسے علّت کی ماہیت اور اس کے اصلی سبب کی عمیق تہ کا ادراک ہو سکے ورنہ ممکن ہے کہ سطحی باتوں سے مغالطہ میں پڑ جائے اور دریافتِ حقیقت سے قاصر رہے۔ بلکہ اسے یہ بھی ضروری ہے کہ طرزِ معاشرت کے ہر ایک پہلو پر غور کی نگاہ ڈالے اور جو امور ان باتوں کے مقتضی ہیں یا ان سے خلاف ہیں ان سب کو ایک دوسرے سے ملا ملا کر اور ان کی دقیق علمی تحلیل کر کے اچھی طرح چھان بین کرے تاکہ وہ مفروضہ بیماری کی سب سے اہم اور اعلیٰ علت کا پتہ لگا سکے۔

اب رہی یہ بات کہ ہماری معاشرت میں ایسی خرابیاں کیوں پڑ گئی ہیں؟ اس کی بابت ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہمارے مرد اور ہماری عورتیں دونوں ایک سے ناتربیت یافتہ اور غیر مہذب ہیں۔ اور ہماری رائے میں اگر ان کو تھوڑی سی تہذیب و تربیت بھی حاصل ہو جائے تو ہماری

سوسائٹی کی حالت اس قدر سدھر جائے گی کہ دوسری قومیں ہم کو رشک کی نگاہ سے دیکھیں
گی۔ اور ہم تمام دنیا میں قابلِ تقلید مثال بن جائیں گے۔ ہمارا یہ دعوے بے دلیل نہیں ہے
بلکہ اس کی محسوس اور کھلی ہوئی دلیل یہ ہے۔ کہ آج بھی ہمارے مہذب طبقوں میں اس بات
کی مطلق شکایت نہیں پائی جاتی۔ اس لیے اگر ہم اس سے بھی زیادہ مہذب اور تربیت یافتہ
ہو جائیں تو یقیناً ہم پر ایک ایسا وقت آجائے گا جب کہ ہمارے تمدن دوست اور مادیت
پسند علماء کو ایسی تشویشناک صورتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے۔ غرضیکہ ہماری موجودہ
خراب حالت ایک طرح [illegible] امراض ہیں جو بہت جلد زائل ہو سکتے ہیں۔ [illegible]
[illegible]
[illegible] اور نئی عمارت بنائیں۔

ہمارا اعتقاد ہے کہ مسلمانوں میں یہ زوال [illegible] ایک رحمتِ الٰہی اور خدا کی جانب سے
مقرر کیا گیا [illegible]
[illegible]
سے اب تک چلا آرہا ہے

لیکن یورپین تمدن جدید کی خارجی باتیں ایسی [illegible] اور زوال پذیر بیماریاں ہیں
ہیں جن کی اصلاح [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] فلاسفر [illegible] کی کتاب ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ کے دیباچہ میں
لکھتا ہے۔

> اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانہ کی پیچیدگیاں سخت خطرناک ہیں۔ مگر ساتھ
> ہی یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ حالت پہلی شفق ہے جو یورپ کے تمام آفاق پر
> نظر آرہی ہے۔

اس کے بعد علامہ موصوف نے ان بہت سی انقلابی حالتوں کی تفصیل دی ہے

جو نوبت بہ نوبت یورپ پر طاری ہوتی رہیں۔ اور جو کہ ہمیشہ سخت اجتماعی (معاشری) اضطرابات سے گھری ہوئی تھیں۔ بعد ازاں اِس نے "کارلائل" ہی کے حسبِ ذیل موقعوں سے استشہاد کر کے بتایا ہے کہ ایسے انقلابات کا حادثات ہونا ایک لازمی امر ہے اور ان کے ساتھ ہی اضطرابات اور پریشانیوں کا وجود بھی ضروری "کارلائل" لکھتا ہے:۔

یہ ایک ضروری امر ہے کہ ہر ایک بناوٹ اور جھوٹ کا پردہ فاش ہو کر اس کی جگہ سچائی اپنا جلوہ دکھائے۔ یہ سچائی خواہ کسی قسم کی ہو اور چاہے جس ذریعے سے آئے۔ لیکن اپنا ظہور لامحالہ دکھائے گی۔ عام اس سے کہ صداقت کا غلبہ خوف اور اضطراب کی سرعتائی سے ہو یا فرانسیسی بغاوتوں کی آفتوں کے ذریعہ سے یا کسی اور وسیلہ سے مگر اس میں شک نہیں کہ ہم آخر کار حقیقت کی طرف ضرور پلٹ آئیں گے۔ لیکن یہ اصلیت جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے آتش دوزخ کے لباس میں ملبوس ہو کر عیاں ہوگی۔ کیونکہ وہ بجز اس صورت کے اور کسی شکل میں، نمایاں ہی نہیں ہو سکتی۔

ان تمام مراتب کے طے ہو چکنے کے بعد بھی اگر ہم میں کوئی ایسا شخص پایا جائے جو ان خوف دلانے والی باتوں اور دھونس دھڑکنوں سے متاثر نہ ہو۔ اور اسی امر پر اصرار کرتا رہے کہ ہمیں ہر ایک بات میں یورپ کی مادی مدنیت والوں کی تقلید ہی کرنا چاہیئے۔ اور خاص کر مسئلہ نسواں میں تو ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ حالانکہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ مسئلہ نسواں کے خوفناک نتائج سے آج یورپ کے علماء اور خیر خواہانِ قوم و ملک کا گروہ بڑا کانپ رہا ہے۔ وہ نامی اخباروں اور رسائل میں صاف صاف تحریر کرتے ہیں کہ ہماری سوسائٹی کی چادر کے صرف دونوں پلے ہی نہیں جلتے بلکہ اس کے وسط میں بھی آگ لگ چکی ہے۔ اور ہم اس عبارت کو پہلے نقل بھی کر چکے ہیں۔ اور وہی علمائے یورپ اپنے اعلٰے درجہ کے علمی مجموعہ یعنی انسائیکلوپیڈیا میں یوں لکھتے ہیں کہ:۔

آخر اس حالت سے چھٹکارا پانے کی کیا صورت ہو سکتی ہے جو ہمیں اگر ہم

اسے لاعلاج تنزل نہ کہیں تو بہت جلد بامِ عزت سے گرا دینے کی دھمکی دے رہی ہے۔

اور یہ جملہ انیسویں صدی کی انسائیکلوپیڈیا سے ہے کہ ہم پہلے بھی نقل کر چکے ہیں۔

عورتوں کے زیادہ مناسبِ حال تعلیم

مسئلہ نسواں کی ایسی علمی تحلیل کرنے اور اس کے ہر ایک پہلو کو علم صحیح کی خوردبین سے دیکھ لینے کے بعد جب کہ ہمیں اس کی حالت و ماہیت کا پورا علم ہو گیا ہے اور ہم پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جو معمولی خرابیاں ہماری معاشرت میں عورتوں کے شاملِ حال ہو رہی ہیں وہ محض ایسی تہذیب سے دور ہو سکتی ہیں جس کی بنیاد حکیمانہ قواعد پر رکھی گئی ہو تو ہم پر یہ واجب ہے کہ کسی ایسے مستحکم ترین اسلوب کو تلاش کریں جس کے ذریعے سے ہم عورت کا وہ تہذیبی فرض ادا کرنے کے بارے میں سبکدوش ہو سکیں جو شرائعِ الٰہی کے موسس اور اپنے مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر عمل پیرا ہونے کا حکم دیتا ہے۔ کیونکہ سرورِ کائنات روحی فداہ کا ارشاد ہے طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ اور اس کی پابندی ہم پر واجب ہے۔ اور چونکہ ہمارے ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ خُذِ الْحِكْمَةَ حَيْثُ مَا كَانَتْ اَوْكَمَا قَالَ علیہ السلام۔ اس لیے تعلیم کا وہ صحیح طریقہ جو عورتوں کے زیادہ مناسب ہو خواہ دنیا کی کسی قوم کے پاس ملے ہم کو اس کی تقلید کرنے میں ذرا بھی تعصب سے کام نہ لینا چاہیئے اور اس کا کبھی نہ خیال کرنا چاہیئے کہ وہ قوم دین اور دنیا دونوں کے لحاظ سے ہمارے حسبِ حال ہے یا ہم سے جداگانہ۔ مگر دوسری جہت سے باوجود اس تصریح کے ہمیں یہ بھی مناسب نہیں کہ ہم کسی امر کے اختیار کرنے پر قبل اس کے کہ عقل و حکمت کے ذریعے سے اس کی پوری چھان بین کریں، یونہی جھک پڑیں۔ اس لیے کہ ہمارے پیشوا صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی فرمان ہے "المومن فطن حذر"۔ لہٰذا ہم کو اگر اپنا یوسفِ گم گشتہ کسی قوم کے پاس مل جائے تو ہم اسے سر آنکھوں پر لیں گے۔ اور اس طرح ایک عظیم الشان دینی ہدایت پر عمل کر سکیں

گے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا ہے۔ [illegible] اور اگر ہم اپنا
مقصد یہ نہیں [illegible] تو [illegible] چند [illegible] کام لے کر اور اپنی ذہنی قوتوں سے [illegible] سے
خود ہی ایسا ڈھنگ تجویز کریں گے جو [illegible] بشری اور فطرت انسانی پر [illegible] منطبق ہو تو ہم
اپنی جانوں پر رحمت الٰہی کے روک نازل ہونے کی دعا کریں گے تاکہ وہ ہمیں اپنے [illegible] سیدھے
راستہ کی طرف ہدایت کرے۔ کیونکہ خداوند کریم کی عنایت ہم کو تلاش حقیقت کے بیچ بے کار ہاتھ
پیر مارنے دیتی ہی۔ اس نے ہم سے رہنمائی کا وعدہ کیا ہے۔ اور خدا کا وعدہ سچا ہوتا ہے۔ جیسا
کہ ارشاد فرمایا۔ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ اور جن لوگوں
نے ہماری جستجو میں کوشش کی بے شک ہم ان کو اپنی راہیں [illegible] اور اس میں شک نہیں کہ خدا
نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔

میرے خیال میں دنیا کی اور قوموں کے یہاں تعلیم نسواں کے جو اسلوب [illegible]
جیتی کرنا اور نہیں پڑھ کر پڑھا کر اپنے استعمال میں لانا سخت محنت و مشقت کا بار برداشت کرنے
کے ہم معنی ہے۔ کیونکہ ان قوموں میں جو عقلمند ہیں وہ خود اس بات کا علانیہ اقرار کر رہے ہیں کہ انہوں
نے عورتوں کی تہذیب کے لیے جو طریقے وضع کیے تھے ان کا انجام سخت خراب اور باعث
مصیبت نکلا ہے۔ اس لیے وہ تمام اسلوب از سر نو حد درجہ عظیم الشان تغیر و تبادلی کے محتاج
ہیں۔ لہذا اس حالت میں ان کی تقلید کرنا نادانی اور حماقت نہیں تو کیا ہے؟ اور ایسی ناسمجھی جو
قابل معافی ہو بلکہ ایسا امر جسے عقل کبھی قبول نہ کرے۔ کیونکہ تجربہ کاروں کی تحقیقیں نہ ماننا اس کے
ہم معنی ہے۔ کہ اپنے آپ کو سخت ترین مصائب میں ڈال دیا جائے اور اپنے نفس کو تیر بلا کا نشانہ
بنا دیا جائے۔

اب ہم اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کہ یورپ میں تعلیم نسواں کے طریقے حد درجہ کے
مضرت رساں اور احکام خلقت نسائیہ پر غیر منطبق ہیں، روئے زمین کی سب سے بڑھ کر اور
معزز ترین متمدن قوم کو انتخاب کر کے اس کے طریقہ تعلیم نسواں پر ریمارک کرنا چاہتے ہیں۔ کون
سی قوم؟ جس کو آج عمران و تمدن میں اعلیٰ دستگاہ اور بہترین شرف حاصل ہے۔ اور پھر اپنے مدعا
کی بابت اس قوم کے عام لوگوں سے بھی استفسار نہ کریں گے بلکہ ان کے سب سے زبردست عالم

اور اُستاذ الاساتذہ سے دریافت کریں گے۔ ایسا علامہ جس کے فضل و کمال اور قومی غیرت مندی اور شرافت نسبی کو تسلیم کرنے پر اس قوم کے دو فردوں میں اختلاف نہ پایا جائے۔

مشہور عبرانی فیلسوف ژول سیمان جس کی عزت فرانسیسی قوم میں خصوصاً اور دیگر یورپین قوموں میں عموماً اظہر من الشمس ہے۔ ریویو آف ریویوز جلد ۱۸ میں لکھتا ہے:۔

سنہ ۱۸۴۸ء میں لوگوں کو یہ شکایت تھی۔ کہ عورتوں کی تہذیب و تربیت پر ذرا بھی توجہ نہیں دی جاتی۔ مگر آج دیکھا جائے تو وہ اس کے برعکس یہ شکوہ کر رہے ہیں کہ عورتوں کی تہذیب اعتدال کی حد سے گزر کر افراط کے مرتبہ تک پہنچ گئی۔ ہاں بلاشبہ ہم جلد رجہ کی کمی سے نکل کر ہولناک افراط کے مرتبہ تک جا پہنچے ہیں۔

اس کے بعد علامہ موصوف نے اس اسلوب تعلیم کے نتائج کی خرابی دکھا کر جس نے عورت کو بالکل مرد بنا دیا ہے۔ زور سے چیخ کر کہا۔

"یہ واجب ہے کہ عورت عورت ہی رہے"

بعد ازیں اس نے وہ خرابیاں بیان کی ہیں جو عورت کی اس حالت سے گھرانوں پر طاری ہوئیں۔ اور ہم وہ باتیں پچھلے ابواب میں بجنسہ نقل کر چکے ہیں جن کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ یہ بات تو فرانسیسی قوم کی لڑکیوں کی تہذیب و تعلیم سے مختص تھی۔ اب انگریزی قوم کی حالت دیکھنا چاہو تو اس کے تعلیم نسواں کا ناپسندیدہ اسلوب بیان کرنے کے لیے ہم مشہور علامہ سامؤل سمائلس کے اقوال سے استشہاد کریں گے جو انگلستان کا سب سے بڑا مصنف اور علم اخلاق و تمدن کا علامہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اور جس کی متعدد تصانیف فرنچ زبان میں یا یورپ کی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہیں، وہ اپنی کتاب الاخلاق میں تحریر کرتا ہے:۔

ایک شریفہ اور ربۃ العائلہ عورت کی قدیم رومانیوں کے ہاں سب سے بڑی تعریف یہ تھی۔ کہ وہ محض منزلی دائرہ میں محدود اور اس میں سوت کاتنے کا کام کیا کرتی تھی۔ ہمارے زمانہ میں کہا جاتا ہے کہ عورت کو علم الکیمیا کا صرف اس قدر حصہ سیکھنا چاہیئے۔ جس کے ذریعے سے وہ ہانڈی میں ابال آنے کی صورت میں اس کی حفاظت کر سکے۔ اور فن جغرافیہ سے اس کو صرف اپنے گھر کے مختلف سمتوں کی

کھڑکیوں اور روشندانوں کے فوائد کا امتیاز حاصل کرنا کافی ہے۔ علاوہ بریں لارڈ بائرن
جو عورتوں پر حد سے زیادہ فریفتہ اور ان کی اطاعت میں بدنام تھا لکھتا ہے کہ عورت
کے کتب خانہ میں بجز توریت اور طباخی کی کتابوں کے اور کتاب ہونی ہی نہ چاہیئے مگر
بائرن کی یہ رائے عورت کے اخلاق اور اس کی تہذیب پر نظر کرتے ہوئے نہایت
سخت گیری پر مبنی اور غیر معقول ہے۔ ایک طرف تو اتنی سخت گیری برتنے کا فیصلہ کیا جاتا
ہے اور دوسری جانب اس کی خلاف رائے جو آج کل بہ کثرت شائع ہو رہی ہے۔ وہ
ولولۂ جنون تصور کیے جانے کے قابل اور نظام فطرت پر بالکل غیر منطبق ہے۔ کیونکہ
وہ عورت کو اس قدر تہذیب دینے کی مقتضی ہے کہ بقدر امکان عورت مرد کے مساوی
اور ہم مرتبہ بن جائے۔ یہاں تک کہ ان دونوں میں بجز جنسی فرق کے اور کوئی امتیاز باقی
نہ رہے یعنی عورت و مرد کے حقوق ہر طرح مساوی ہوں۔ سیاسی معاملات میں ان کی
رائے لی جائے اور عورت بھی تمام وحشت خیز اصولی زندگی کے معرکوں۔ کسب ذات
اور کسی مرکز یا قوت یا رسوخ و اقتدار حاصل کرنے کی رقابت و جنگ میں مرد کی مزاحم
بن سکے۔

اب صرف امریکن قوم باقی رہی اس کے اسلوب تعلیم نسواں کی عدم صلاحیت دکھانے کے لیے
محض نامور انشا پرداز "لوسن" کی شہادت کافی ہے جس نے فرانس کے رسالہ ریویو آف ریویوز میں
حسب المطلب ایڈیٹر امریکن عورتوں کی حالت پر ایک بسیط مضمون دیا تھا اور وہ مضمون جلد [illegible]
مذکورہ میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں "لوسن" نے مدارس نسواں کی مشرح حالت بیان کرنے کے ضمن میں
لکھا ہے۔

مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ مدرسے ان نوجوان لڑکیوں کے لیے قائم کیے گئے ہیں جو اپنی
معلومات کو ذریعۂ کسب معاش و مشغلہ بنانا چاہتی ہیں۔ یا زنانہ ڈاکٹر، زنانہ انجنیئر او معلم
وغیرہ بننا چاہتی ہیں۔ اسی لیے دیکھا جاتا ہے کہ ان مدرسوں میں تہذیب کا درجہ بہت
کم ہے (یعنی وہ تہذیب جو عورت کے لیے خاص ہے) ورنہ معاً نہایت قوی ہے
عورتیں اور لڑکیاں نہایت تدقیق کے ساتھ علوم کیمیا، ریاضیات اور طبیعیات میں تعلیم

باقی ہیں۔ مگر بایں ہمہ جو نوجوان ان علوم میں اوّل نمبر پہ پاس ہوتی ہے اور جس نے پروگرام کے تمام دفعات پہ عبور کر لیا ہوتا ہے۔ وہ نظامات خانہ داری کے معمولی سے معمولی اور سادہ سے سادہ امور سے بھی سخت ناواقف ہوتی ہے۔

یہ ان لوگوں کے اقوال ہیں جن کو صاحبِ خانہ کہنا چاہیئے۔ اور ہم کس دلیل سے ان کو جھوٹا قرار دے سکتے ہیں؟ بنا بریں ہم مسلمان کو ان یورپین اسالیبِ تعلیم نسواں میں سے کسی اسلوب کی پیروی کی اس وقت صلاح دے سکتے ہیں جبکہ ان تمام اقوال کو ذرا بھی قابلِ اعتناء نہ تصور کریں۔ اور جو لوگ ان طریقوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں خواہ وہ اسی قسم کے چیدہ افراد ہی کیوں نہ ہوں ان کو [illegible] و بدبختی کا الزام دیں۔ غرضکہ جب ہم کو یہی صورت پسند آتی ہے تو [illegible] کرنا چاہیں [illegible] کی تقلید [illegible] کے بارہ میں ہمیں مانع نہیں آ سکتی۔ لیکن اگر امرِ حق کی پاسداری اور پابندی کا خیال ہے تو ہم پہ لازم ہے کہ اہلِ یورپ کے حالات کو بہ نظرِ اعتبار دیکھیں اور جن باتوں نے انہیں جہل بازی [illegible] میں مبتلا کر دیا ہے ان سے بچنے کی سعی کریں تاکہ آخر کار ہمیں بھی وہی نہ کرنا پڑے جو علامہ [illegible] کہتا ہے کہ:-

"پہلے ہم کو کسی تعلیم [illegible] کی شکایت تھی [illegible] اب ہم تعلیم کی زیادتی [illegible] کا رونا روتے ہیں"

اجمالی نظر

گو ہم اپنی بحث میں حس اور تجربہ کے ایسے دلائل پیش کرنے کے راستے پہ قدم زن رہے ہیں جن کو بجز اس کے اور کسی صورت میں غلط نہیں قرار دیا جا سکتا کہ پہلے ان کے چشم دید اور محسوس مقدمات کی تکذیب کر لی جائے جو ایک ناممکن امر ہے۔ تاہم مجھے یہ خوف ہے کہ موضوع بحث کے متعدد اقسام میں بٹ جانے سے مضمون طویل ہو گیا ہے اور اس حالت میں ممکن ہے کہ ناظرین کو وہ بہت سے نظریات یاد نہ رہے ہوں جو عورت کی پردہ نشینی کی ضرورت ثابت کرتے ہوئے بکار آمد دلائل ہو سکتے ہیں۔ اس لیے میں نے ارادہ کیا کہ ان امور کو بالاجمال چند صفحوں میں لکھ دوں تاکہ معمولی غور سے بھی ان کی اجمالی شکل پہ احاطہ کرنا آسان ہو۔ اور میں نے اس کی تفصیلی باریکیاں معلوم کرنے کا بار ناظرین کی یادداشت یا دوبارہ مطالعہ کتاب پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ نظریات حسب ذیل ہیں:-

۱۔ عورت جسمانی اعتبار سے بہ نسبت مرد کے بہت کمزور ہے۔ اور علم قبول کرنے میں بھی اس کا درجہ گھٹا ہوا ہے۔ عورت کی یہ کمزوری اس لیے نہیں کہ اس طرح پہ وہ مرد کی مطیع اور اس سے حقیر بنی رہے۔ بلکہ اس لیے کہ اس کا وظیفۂ طبیعی اور خاص فرض اس سے زائد قوت کا خواہاں نہیں ہوتا جو اس کو دی گئی ہے۔ یہ ایک طبیعی اور فطری حالت ہے یعنی عورت ہزار کوشش کرے کہ وہ جسم اور ادراک کے لحاظ سے مرد کی ہم پلّہ بن جائے۔ لیکن یہ انہونی بات ہے۔ اور وہ ہرگز اس مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتی۔

۲۔ ہر ایک مخلوق کا خاص کمال ہے۔ اور عورت کا کمال جسمی توانائی اور وسعتِ معلومات پہ موقوف نہیں بلکہ وہ ایک روحانی قوت میں منحصر ہے۔ جو عورت کو بہ نسبت مرد کے بہت زیادہ اور اعلیٰ درجہ کی دی گئی ہے۔ وہ قوت کیا ہے؛ عورت کا دقیق اور زندہ شعور اور اس کے حد درجہ رقیق احساسات، اور پھر ان سب پر بڑھ چڑھ کر عورت کا نیکی کے راستہ میں اپنی جان تک قربان

کر دینے کے لیے تیار رہنا۔ اس لیے اگر یہ مواہب اور فطری قوتیں اپنے صحیح قواعد کے مطابق عورت میں نشو و نما پائیں تو وہ اپنے حقوق کی حفاظت و تائید کے لیے مرد کی طرح زور آور کلائی اور تیز دم تلوار کی محتاج نہ رہے بلکہ یہی باطنی قوتیں اس کو معاشرت کے ایک ایسے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچائیں کہ اس کے سامنے عزت و تکریم کے لیے مردوں کے سر خود بخود جھک جائیں۔ لیکن خدائے کریم نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ فرما دیا ہے کہ عورت کی یہ اندرونی قوتیں اسی وقت نشو و نما پا سکتی ہیں جبکہ وہ مرد کے زیرِ اثر اور زیرِ حفاظت زندگی بسر کرے۔ خواہ وہ اسی حالت میں رہ کر اپنے مواہب میں مرد پر فوقیت کیوں نہ لے جائے اور اسے اپنا بندۂ بے دام ہی کیوں نہ بنائے پھر بھی عورت کو یہ بات نہیں بھاتی کہ وہ مرد کو اپنی فطری خوبیوں کے دام میں اسیر کرے کیونکہ ایسی صورت واقع ہونے میں اس کے ہتھیار کی تراش میں فرق آجاتا ہے۔ اور اس کی فطری موہبت کی چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ خود ایک ایسی کش مکش میں گرفتار ہو جاتی جو اسے پسند نہیں آتی۔

۳۔ عورت اس کمال کو اس وقت تک کبھی نہیں حاصل کر سکتی جب تک وہ کسی مرد کی بیوی اور چند بچوں کی صحیح تربیت دینے والی ماں نہ ہو اور اس کی کچھ یہی وجہ نہیں ہے کہ حق بحقدار رسید والی مثل ہو۔ بلکہ عورت کے ملکات کا نشو و نما اور اس کے اندرونی جذبات کی تہذیب و درستی بس اس حالت میں ہو سکتی ہے کہ وہ بیوی اور ماں بنے۔ کیونکہ اسی غرض کے لیے وہ جسمانی اور روحانی دونوں اعتبار سے پیدا کی گئی ہے۔

۴۔ عورت کا مردوں کے کاروبار میں حصہ لینا اور خارجی زندگی کے خطرناک معرکوں میں اس کی شریک بننا در اصل یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اپنے فطری جذبات کو قتل کر رہی ہے۔ اپنے ملکات کو مٹا رہی ہے۔ اور اپنی رونق و طراوت کو پژمردہ، اپنی ترکیب کو خراب اور اپنی قوم کے جسم میں خلل پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یورپین عورت کا منزلی زندگی کے دائرہ سے قدم نکالنا ان ممالک کے علماء کی نگاہوں میں قوم کے دل و جگر پر زخم کاری نظر آتا ہے۔ اور اس بات کا ایک نشان تصور کیا جاتا ہے کہ مرد چاہے تو عورت کو سخت سے سخت مصیبت و آفت میں مبتلا کر سکتا ہے۔ چنانچہ اب وہی علماء اس حالت کا دائرہ تنگ کرنے پر زور لگا رہے ہیں۔

۵۔ عام طور پر نوعِ انسانی کی بہتری اور خاص کر خود عورت کی بہبودی کے لیے عورتوں کا پردہ میں رہنا ایک ضروری امر ہے۔ کیونکہ پردہ عورت کی خود مختاری اور استقلال کا ضامن اور اس کو

حریت کا کفیل ہے نہ کہ اس کی ذلت کی علامت اور اس کے اسیری کا پیش خیمہ اور ہم اس بات کو بیان کر آئے ہیں کہ پردہ عورت کے کمال کا مانع نہیں۔ بلکہ وہ اس کمال کے ذرائع و اسباب کا مہیا کرنے والا ہے۔ تاہم چونکہ ہر چیز میں کچھ نقصانات بھی ضرور ہوتے ہیں ۔ اس لحاظ سے اگر پردہ میں بھی بعض جزوی خرابیاں پائی جائیں تو اس کے بالمقابل جو فوائد اور خوبیاں ہیں وہ حد سے بڑھ کر قیمتی ہیں۔ اور سب سے زائد خوبی یہ ہے کہ پردہ عورت کو اپنے وظیفہ طبیعی کے دائرہ سے قدم باہر رکھنے میں مانع ہے۔ وہ وظیفہ طبعی جس میں ہر عورت کی سعادت کا انحصار ہے۔ اور یہی پردہ عورت کو اپنی ان اعلیٰ خصوصیتوں کو نشو و نما دینے کا موقع دیتا ہے جو اس معرکۂ زندگانی میں اس کے یکتا ہتھیار ہیں۔

۶۔ مادی مدنیت کی عورتوں میں چاہے جس قدر ظاہری نمائش اور دل فریبی پائی جاتی ہو۔ لیکن وہ کامل جنس نسواں کی نمونہ یا کمال نسوانی کے راستہ پہ چلنے والی ہرگز نہیں ہیں اور خود ان ممالک کے علماء بھی اس حالت کے شاکی پائے جاتے ہیں۔ اور اس رفتار کو روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

۷۔ یورپ اور امریکہ کے تمام ممالک میں تعلیم نسواں کے طریقے عورتوں کی حالت کے لیے مفید اور مناسب نہیں جس کی شہادت وہیں کے اہل علماء کے اقوال سے بہم پہنچتی ہے۔

۸۔ اسلام نے عورت کے بارے میں جو ہدایتیں کی ہیں وہ فطرت نسوانی سے پوری طرح مطابق اور موافق ہیں۔ گویا اسلامی تعلیمات عورت کے جملہ خصائص اور ملکات کو اچھی صورت میں ڈھالنے کے لیے اعلیٰ درجہ کے سانچہ سے مشابہ ہیں۔ یعنی اگر ان تعلیمات کے موافق عورت کے خصائص نشو و نما پائیں تو مسلمان خاتون بغیر اس کے کہ اپنے طبیعی حدود سے ایک قدم بھی آگے بڑھے بہت اعلیٰ درجہ کی کامل و اکمل عورت بن سکتی ہے۔

۹۔ مسلمان خاتون میں کمال جنس نسوانی کے اعلیٰ و اکمل مرکز تک پہنچنے میں صرف اتنی ہی کمی ہے کہ وہ صرف علوم ضروریہ کے مبادی سے بے خبر ہے۔ اور جب اسے اتنی تعلیم دے دی جائے۔ تو پھر اس میں کوئی نقص باقی نہ رہے گا۔

یہ سب نو مسائل ہیں جن کے ثبوت میں مشاہدات اور واقعات اور تجربہ کے علوم کے زبردست اصول پیش کر کے میں نے استدلال کیا ہے یا موجودہ زمانہ کے سب سے بڑے علمائے تمدن و عمران کے اقوال سے استشہاد کیا ہے۔ نیز اس بحث میں میں نے جہاں تک بن پڑا فلسفہ عملی (پریکٹیکل سائنس)

کے اسلوب کا امتیاز رکھا ہے۔ گو اس میں سخت مشقت اور دشواری پیش آئی تاہم میری اس سے دو اعلیٰ درجہ کی غرضیں تھیں جو حسبِ ذیل ہیں۔

اوّل یہ کہ پردۂ نسواں کے حامیوں کا پہلو قوی کیا جائے تاکہ ان پر پردہ کی رسم کو معترضین کے حملوں سے بچانے میں آخر دم تک ثابت قدمی دکھانا آسان بن جائے۔ اور وہ عملاً اس بات سے واقف ہو جائیں کہ حق انہیں کی جانب ہے۔ اور ان کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ دنیا کی ہر ایک حرکت خواہ وہ بظاہر کسی حالت میں نظر آتی لیکن دراصل اس کا رخ ہر ایک کاروبار زندگی میں فطرتِ انسانی کے اصلی مرکز ہی کی طرف ہوگا۔ اور وہ فطرت وہی ہے جس کی ہدایت ہمارا دین حنیف فرماتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمانوں میں بُری قسم کا اور قابلِ افسوس تعصب ہرگز نہیں پایا جاتا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ وہ ان نئی بدعتوں کے انبوہ میں فطرتِ سلیمہ کی محافظت کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ اور یوں وہ چاہے جس قدر بھی مادی طریقۂ زندگی کے گھوڑ دوڑ میں اور قوموں سے پیچھے ہوں لیکن اس کی وجہ ان میں کسی اندرونی بیماری کا پایا جانا نہیں۔ ہاں چند خارجی اور سریع الزوال حالتیں ان کو لاحق ہو رہی ہیں جو معمولی کوشش سے دور ہو جائیں گی۔ اور پھر مسلمانوں کی توانائی بحال ہو سکے گی۔ اس حیثیت سے تو مسلمان بہ نسبت ان مادی مدنیت والوں کے باقی اور قائم رہنے کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ جن کی مدنیت نے انسانیت کا چہرہ بدنما بنانے اور فطرتِ بشری کو اس کے اکثر پہلوؤں سے مسخ کر ڈالنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے۔ یہاں تک کہ ان کی اس خلاف ورزی سے ان میں بہت سے ایسے مہلک امراض پیدا ہو گئے ہیں۔ جو عنقریب ان کا خاتمہ کر دینے کی دھمکی دے رہے ہیں

دوسری غرض یہ ہے کہ ہمارے وہ بھائی جو خواہ مخواہ ہاتھ دھو کر پردہ کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اس بات کے قائل ہو جائیں کہ ہم نے تعصب اور رسم و رواج کی کورانہ تقلید کی وجہ سے پردہ کی حمایت نہیں کی ہے۔ بلکہ ہمارا یہ فعل فطرت کی امداد و اعانت کے لیے سرزد ہوا ہے۔ اور فطرت کیا ہے؟ دینِ اسلام ہم اسی صریح حق کی جنبہ داری کرتے ہیں جو اس دنیا کے پردہ پر صرف مسلمان کے حصّہ میں آیا ہے۔ تاکہ شاید ہمارے وہ مہربان صحیح غور کے بعد بجائے اپنی پردہ دری کے پردہ داری پر آمادہ ہو جائیں اور ہمارے ہم آہنگ بن کر ان علاماتِ مرض کو زائل کرنے کی کوشش کریں جو ہماری مصیبت کا باعث بن گئی ہیں اور اس طرح ہم اس مقدس فرض کو بھی ادا کر سکیں گے جو ہمارا ضمیر قوم و ملت کے لیے ہم پر واجب قرار دیتا ہے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ

الحمد للہ والمنہ کہ رسالہ نافع اہلِ ایمان و جمیع انسان بفضل الرحمٰن

المسمّٰی بہ

اَللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ

فی

تَكَلُّمِ الْمَرْأَةِ بِاٰيَاتِ الْقُرْاٰنِ

مع نصیحت ثالثی مقلّدین و محققین

تالیف انیف حضرت مولینا محمد ابو القاسم رحمہ اللہ العالم

ابن مولوی محمد سعید صاحب مرحوم و مغفور محدث بنارسی

المکتبۃ الاثریہ جامع مسجد باغ والی

سانگلہ ہل ضلع شیخوپورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلحمدُ لِلّٰہِ الکبیرِ المنّانِ ۝ الفردِ الصّمدِ القدیرِ الرّحمٰنِ ۝ نحمدُہٗ وَنشکرُہٗ سبحانہٗ و تعالیٰ علیٰ جمیعِ النِّعَمِ وکاملِ الاحسانِ ۝ ونسألُہ الاستقامۃَ علیٰ سُنَنِ الھدایۃِ ، لِنفوزَ باعلیٰ غُرفاتِ الجنانِ ۝ ونعوذُ بہٖ من شرورِ انفسنا ومن سیّئاتِ اعمالنا فی الاسرارِ والاعلانِ ۝ والحمدُ لِلّٰہِ الواحدِ الاحدِ الکریمِ الدّیّانِ ۝ والحمدُ لِلّٰہِ الّذی لا نُحصی ثناءً علیہِ وھو البادی بالاحسانِ ۝ والحمدُ لِلّٰہِ الّذی لا یبلغُ غایۃَ حمدِہٖ اِلسانُ ۝ والحمدُ لِلّٰہِ العظیمِ الشّانِ القدیمِ الاحسانِ ۝ الباقی وکلُّ من علیھا فانٍ ۝ لا یخفیٰ علیہِ فی الارضِ ولا فی السّماءِ کلَّ یومٍ ھو فی شانٍ ۝ یکشفُ کرباً و یغفرُ ذنباً و یرفعُ قوماً و یضعُ آخرینَ ولا یزالُ علیٰ مرِّ الزّمانِ ۝ یُحبُّ التّوّابینَ والمتطھّرینَ و یُبغضُ المتکبّرینَ والمتجبّرینَ واھلَ البغیِ والعدوانِ ۝ نحمدُہٗ ونستغفرُہٗ ونسألُہُ الھدایۃَ ونعوذُ بہٖ من الخزیِ والھوانِ ۝ والحمدُ لِلّٰہِ جاعلِ الجنانِ ۝ لِاھلِ الایمانِ والحمدُ لِلّٰہِ الّذی سخّرَ الرّیحَ لِسلیمانَ ۝ علیہِ الصّلوٰۃُ والسّلامُ الاتمّانِ الاکملانِ والحمدُ لِلّٰہِ الّذی جعلَ مکارمَ الاخلاقِ من اعمالِ الجنانِ ۝ وجعلَ حسنَ الخُلقِ افضلَ شیءٍ یوضعُ فی المیزانِ ۝ نحمدُہٗ علیٰ نعمہٖ فانّہٗ تعالیٰ یُحبُّ ان یحمدَ

بِكُلِّ لِسَانٍ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ○ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي مَكَّنَ الْمَرْأَةَ فِي التَّكَلُّمِ بِآيَاتِ الْقُرْاٰنِ ○ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ الْمَلِكُ الْمَنَّانُ ○ الْمُتَفَرِّدُ بِصِفَاتِ الْكَمَالِ الْمَخْصُوْصُ بِنُعُوْتِ الْجَلَالِ الْبَاقِيْ لَا شَرِيْكَ لَهٗ فِيْ مُلْكِهٖ وَلَا ثَانٍ ○ شَهَادَةً مَنْ شَهِدَ بِهَا فَهِيَ لَهٗ نَجَاةٌ وَّاَمَانٌ وَشَهَادَةٌ مَصْحُوْبَةٌ بِتَضَرُّعٍ وَّاِذْعَانٍ ○ وَشَهَادَةُ سَعْدٍ نَائِلُهَا يَوْمَ الْفَزَعِ الْاَكْبَرِ بِفَضِيْلَةِ الْاِيْمَانِ ○ وَكَلِمَةً لَا يَسْبِقُهَا عَمَلٌ وَّلَا تَتْرُكُ ذَنْبًا عَلَى الْاِنْسَانِ وَنَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهُ الْمُفَضَّلُ عَلَى الْاَنْبِيَاءِ وَالْمَلَائِكَةِ وَاَهْلِ الْعِرْفَانِ ○ الْمَبْعُوْثُ بِاَفْضَلِ الْاَدْيَانِ ○ اِلَى الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ مِنْ اِنْسٍ وَّجَانٍ ○ الْمَنْعُوْتُ بِالْخُلُقِ الْعَظِيْمِ وَالسَّمْتِ الْقَدِيْمِ الَّذِيْ وَصَفَهُ الْقُرْاٰنُ ○ الَّذِيْ اُعْطِيَ فَوَاتِحَ الْكَلِمِ وَجَوَامِعَهٗ وَاخْتَارَ اللّٰهُ لَهٗ خَيْرَ الْكَلَامِ الْقُرْاٰنَ ○ اَوَّلُ النَّاسِ خُرُوْجًا اِذَا بُعِثُوْا وَخَطِيْبُهُمْ اِذَا وَفَدُوْا اِلَى الْمَلِكِ الدَّيَّانِ ○ اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَهْلِ الْاَرْضِ اَمَانٌ ○ وَسَادَاتُ اَهْلِ الْاِيْمَانِ ○ اَمَّا بَعْدُ

بندہ آثم محمد ابوالقاسم بن مولانا مولوی محمد سعید مرحوم و مغفور محدث بنارسی ناظرین رسالہ ہذا سے گذارش کرتا ہے کہ یہ رسالہ کیا ہے عبرت کا مقالہ۔ اس کو دیکھ کر اور پڑھ کر ذرا عبرت پکڑنا چاہیئے کہ سلف کے لوگوں کی زبان مبارک ماشاء اللہ کیسی تھی۔ کہ بعض صاحب قرآن ہی قرآن سے باتیں کرتے تھے۔ یہ اس واسطے کہ مبادا کہیں زبان سے ایسی بات ناشائستہ نہ نکل جائے کہ جس کے سبب سے بروز قیامت جواب دہی کرنا پڑے۔ لیکن آج کل کی زبانوں کو ذرا خیال کرنا چاہیئے کہ زبان سے کیسی کیسی واہیات باتیں نکلا کرتی ہیں چنانچہ اس کے بارے میں ایک نصیحت اسی رسالہ کے پیچھے ملحق ہے تاکہ ناظرین اس سے اور اس سے عبرت پکڑیں ع۔ بر رسولاں بلاغ باشد وبس۔

بہت محنت و مشقت و جاں فشانی سے اس رسالہ میں جتنی آیتیں ہیں ان کا ترجمہ موافق مطلب اور حوالہ قرآن مجید میں ملنے کا دیا گیا ہے۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں سلف کی ایک نیک عورت[۱] کی داستان بہت ہی مناسب و لائق معلوم ہوتی ہے جیسا کہ آگے آتی ہے۔ یا اللہ! اس رسالہ کو ایسا ہی اثر بخش کہ میرا یہ دعویٰ جو محض تیرے فضل کے سہارے پر ہے سب پہ سچ ہو جائے اور یہ رسالہ تا قیامت تحت بصارت ناظرین جاری رہے اور اس بندہ کو جزائے خیر عطا فرما۔ آمین برحمتك یا ارحم الراحمین۔

آغاز داستان رابعہ بصری

یہ عورت یعنی رابعہ تبع تابعین کے عہد میں تھی اور فصاحت و بلاغت کے کمال سے اُس نے قرآن مجید پر اس قدر تصرف حاصل کر لیا تھا کہ ہماری نظر میں اس کی ذکاوت اور نیز اس کا وہ ملکہ جس کی بدولت وہ قرآن شریف کی ہر آیت کو نہایت مناسب موقع پر استعمال کرتی تھی بہت ہی حیرت انگیز چیز ہے اور شاید اپنے اس کمال کے اعتبار سے اسلام کی تیرہ سو برس کی مدت میں وہ منفرد ثابت ہو گی۔

عبداللہ بن مبارک جو بہت بڑے محدث ہیں اور امام اعظم ابو حنیفہ کوفی علیہ الرحمۃ کے ہمعصر ہیں بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں مکہ معظمہ گیا اور مدینہ منورہ کے ارادہ سے اپنی اونٹنی پر سوار تن تنہا جا رہا تھا اور عرب کے ریگستان اور پہاڑوں کی گھاٹیاں قطع کرتا چلا جاتا تھا کہ راستہ میں ایک جگہ دور پر کچھ سیاہی نظر آئی قریب جا کر غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک ضعیفہ عورت بیٹھی ہوئی ہے۔ نہ کوئی آگے ہے نہ کوئی پیچھے۔ ایک سوتی چادر اور ایک سوتی اوڑھنی سر پر پڑی ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا اور کہا (السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ) تو اس نے جواب دیا:

---

[۱] ایک نیک عورت کا نام رابعہ ہے البصرہ کی رہنے والی ہے یعنی مائی رابعہ بصری جس سے ہر مسلمان واقف ہے ۱۲

سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ [۱]

سلامتی کہی جاتی ہے اللہ مہربان کی طرف سے

عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں میں نے کہا خدا تم پر رحمت نازل کرے یہاں کیا کرتی ہو؟ وہ عورت بولی :-

وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ [۲]

اللہ جس کا راستہ بھلا دے پھر اس کو کوئی بتانے والا نہیں ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ اس جواب سے میں سمجھ گیا کہ یہ راستہ بھولی ہے۔ کہتے ہیں کہ پھر میں نے پوچھا اب کہاں کا قصد ہے اور اب کہاں جاؤگی۔ وہ بولی :-

[۳] سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى

پاک ہے وہ اللہ جس نے اپنے بندہ کو ایک رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی۔

وہ کہتے ہیں میں سمجھ گیا کہ یہ حج سے فارغ ہو کر اب بیت المقدس کو جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نے اس سے پوچھا کہ یہاں آئے ہوئے تمہیں کتنی مدت ہوئی ہے۔ وہ بولی :-

ثَلَاثَ لَيَالٍ سَوِيًّا [۴]

یہاں تین راتیں پوری ہوئیں۔

وہ کہتے ہیں میں نے کہا آپ کے پاس کھانا وغیرہ کچھ نہیں ہے کیسے گذارا کرتی ہو؟

وہ بولی :-

هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ [۵]

وہی اللہ کھلاتا اور پلاتا ہے

وہ کہتے ہیں میں نے کہا آپ وضو کیسے کرتی ہو یہاں تو کہیں بھی پانی نہیں ہے۔

وہ بولی :-

۱؎ سورہ یٰس رکوع ۴۔ ۲؎ سورہ مومن رکوع ۴۔ ۳؎ سورہ بنی اسرائیل رکوع ۱۔

۴؎ سورہ مریم رکوع ۱۔ ۵؎ سورہ شعراء رکوع ۵۔

فَإِن لَّمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا [۶]

اگر پانی تمہیں نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کر لو۔

وہ کہتے ہیں میں نے کہا میرے پاس کھانا ہے کھاؤ گی۔ وہ بولی

ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ [۷]

رات تک روزہ کو پورا کر کے تب کھانا چاہیئے۔

وہ کہتے ہیں میں نے کہا یہ مہینہ رمضان کا تو نہیں ہے۔ وہ بولی

وَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ [۸]

جو نفل کے طور سے روزہ رکھے تو اسی کا بھلا ہے۔

وہ کہتے ہیں ہم نے اس سے کہا کہ ہم لوگوں کو تو سفر میں روزہ رکھنا مباح ہے۔ وہ بولی

وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ [۹]

اگر روزہ ہی رکھو تو کچھ بُرا نہیں اگر تمہیں ذرا بھی عقل ہوتی تو بار بار اس کا سوال نہ کرتے

عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں کہ آخر اس کی قرآن خوانی سے عاجز آکر میں نے کہا کہ جس طرح

میں تم سے آزادی سے باتیں کرتا ہوں اسی طرح آزادی سے تم مجھ سے باتیں کیوں نہیں کرتیں۔

ہم کو قرآن سے سمجھنے میں سخت دقت ہوتی ہے۔ وہ بولی

مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ [۱۰]

انسان کوئی بات نہیں بولتا مگر فوراً لکھ لیا جاتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا اعمال

نامہ قرآن ہی قرآن سے پُر ہو۔

وہ کہتے ہیں کہ میں نے اس سے پوچھا کہ تم کس قبیلہ کی عورت ہو۔ وہ بولی

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا [۱۱]

اور مت پیچھا کر لاعلمی باتوں کا یعنی ایسی باتیں نہ پوچھ۔ بیشک کان اور آنکھ اور دل

سب کو جواب دہی کرنا پڑے گا۔

---

[۶] سورہ نساء رکوع ۷۔ [۷] سورہ بقرہ رکوع ۲۳۔ [۸] سورہ بقرہ رکوع ۲۳۔

[۹] سورہ بقرہ رکوع ۲۳۔ [۱۰] سورہ ق رکوع ۲۔ [۱۱] سورہ بنی اسرائیل رکوع ۴۔

وہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا مجھ سے خطا ہوئی معافی کا خواستگار ہوں۔ وہ بولی

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ط يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ [۱۲]

نہیں سرزنش ہے اوپر تمہارے آج۔ اللہ تم سے درگذر کرے

وہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ تم کو اپنی اونٹنی پر بیٹھا کرکے چلوں چلو گی۔ وہ بولی

وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ [۱۳]

جو کار خیر کرو گے اللہ اس کو جان لیتا ہے پس تم کو اجر دے گا۔

وہ کہتے ہیں کہ میں نے اونٹنی بیٹھائی اور کہا آؤ۔ وہ بولی

قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ [۱۴]

مومن کو لائق ہے کہ بینائی کو پست کرے۔

وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھیں اس کی طرف سے پھیر لیں اور میں نے کہا کہ سوار ہو۔ اس نے جیسے ہی سوار ہونے کا قصد کیا اونٹنی بھڑکی اور اس کی چادر پھٹ گئی۔ اپنی چادر کے پھٹنے کو دیکھ کر وہ بولی

وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ [۱۵]

جو تمہیں تکلیف پہنچے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کا کمایا تھا۔ کچھ رنج کی بات نہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ اچھا تم ذرا سا صبر کرو جاؤ میں اونٹنی کو باندھ دوں تب تم سوار ہونا وہ بولی

فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ [۱۶]

جیسا کہ فیصلہ کے وقت ہم نے سلیمان علیہ السلام کو عقل و سمجھ دے دی تھی اسی طرح تم کو بھی اب آگئی۔

وہ کہتے ہیں کہ میں نے اونٹنی کو باندھ دیا۔ پھر کہا اب سوار ہو۔ تب وہ سوار ہوئی۔ اور اس نے اونٹنی کی پیٹھ پر بیٹھ کر کہا۔

---

[۱۲] سورہ یوسف رکوع ۱۰۔ [۱۳] سورہ بقرہ رکوع ۲۵۔ [۱۴] سورہ نور رکوع ۴۔

[۱۵] سورہ شوریٰ رکوع ۴۔ [۱۶] سورہ انبیاء رکوع ۶۔

سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ [17]

پاک ہے وہ اللہ جس نے اس کو ہمارے لیے مسخر کیا اور ہم اس کے لائق نہ تھے اور ہم کو اپنے رب کی طرف ہی پلٹ کر جانا ہے)

وہ کہتے ہیں کہ میں نے اونٹنی کی نکیل ہاتھ میں لی اور میں دوڑتا ہوا اور چلاتا ہوا چلا۔ اس نے میری یہ حالت دیکھ کر کہا:

وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ [18]

اپنی چال میں میانہ روی کر اور اپنی آواز کو پست کر

وہ کہتے ہیں کہ میں یہ سن کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اور چلانے کی جگہ پہ آہستہ آواز سے بطور ترنم کچھ اشعار پڑھنے لگا۔ وہ بولی

فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ۔ [19]

جو کچھ قرآن سے آسان ہو اسے پڑھو۔ یہ واہیات اشعار کیا پڑھتے ہو۔

وہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ اللہ نے تم کو بہت سی نیکیاں دی ہیں۔ وہ بولی

وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَابِ [20]

نہیں اس کی قدر جانتے مگر ذی عقل۔ ع۔ قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری

عبد اللہ بن مبارک کہتے ہیں کہ تھوڑی دور چل کر میں نے اس سے دریافت کیا کہ تمہارے ... وہ پھر خفہ ہو کر بولی

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ۔ [21]

اے مومنو ایسی چیزوں سے نہ پوچھو کہ اگر تم کو ظاہر کر دی جائے تو تم کو برا لگے

عبد اللہ بن مبارک کہتے ہیں کہ یہ سن کر میں چپ ہو گیا۔ اور وہ بیان کرتے ہیں کہ اب ہم جاتے جاتے اس کے قافلہ میں پہنچے اور ہم نے اس ضعیفہ سے پوچھا کہ قافلہ میں تمہارا

---

[17] سورہ زخرف رکوع ۱۔ [18] سورہ لقمان رکوع ۲۔ [19] سورہ مزمل رکوع ۲۔

[20] سورہ آل عمران رکوع ۱۔ [21] سورہ مائدہ رکوع ۱۴۔

کوئی ہے بھی اور کون ہے۔ وہ بولی

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَۃُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۲۲؎

مال ہے اور ہمارے بیٹے ہیں۔ یہی تو حیات دنیا کی زینت ہے

وہ کہتے ہیں کہ میں سمجھ گیا کہ اس کے بیٹے بھی اس قافلہ میں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا ان کا پتہ کیا ہے۔ وہ بولی

وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ ھُمْ یَھْتَدُوْنَ ۲۳؎

ان کا بہت سا پتہ ہے۔ ایک آسان پتہ یہ ہے کہ ستارہ سے دیکھ کر وہ قافلہ کو چلاتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ ہم کو معلوم ہو گیا کہ اس کے لڑکے قافلہ کے رہبر ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں اونٹ کی مہار یعنی نکیل پکڑے ہوئے خیموں اور رہبروں کے حلقہ میں پہنچ کر میں نے کہا کہ تمہارا کون سا خیمہ ہے بچانو۔ وہ بولی

وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبْرٰھِیْمَ خَلِیْلًا ۲۴؎ وَکَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا ۲۵؎ یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ ۲۶؎

اللہ نے ابراہیمؑ کو دوست بنایا۔ موسیٰؑ سے اللہ نے تکلماً کلام کیا۔ اے یحییٰ مضبوطی سے کتاب کو لے۔ اس سے تین نام ثابت ہوئے۔ ابراہیم۔ موسیٰ۔ یحییٰ

وہ کہتے ہیں کہ میں سمجھ گیا کہ یہ اس کے بیٹوں کے نام ہیں۔ اور میں نے پکارا۔ اے ابراہیم اے موسیٰ۔ اے یحییٰ۔ ناگہاں تین نوعمر لڑکے نکلے۔ جو اس قدر خوبصورت تھے گویا چاند کے ٹکڑے۔ ان لڑکوں نے بیٹے اپنی ماں کو اتارا۔ اور ہم سے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے وہ بولی

اٰتِنَا غَدَآءَنَا لَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِنَا ھٰذَا نَصَبًا ۲۷؎

ہم کو کھانا دو۔ اس سفر میں تکلیف تو ضرور ہوئی

وہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد دیر تک چپ رہی اس لیے کہ لڑکوں نے کہہ دیا کہ یہاں

۲۲؎ سورہ کہف رکوع ۶۔ ۲۳؎ سورہ نحل رکوع ۲۔ ۲۴؎ سورہ نساء رکوع ۸۔

۲۵؎ سورہ نساء رکوع ۲۳۔ ۲۶؎ سورہ مریم رکوع ۱۔ ۲۷؎ سورہ کہف رکوع ۹۔

اس وقت کھانا موجود نہیں ہے۔ بعد ازاں کچھ دیر کے بعد اس عورت نے یکایک باآواز بلند کہا۔

فَابْعَثُوٓا اَحَدَكُم بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ [۲۸]

کسی کو بازار کی طرف بھیجو۔ اس کو لائق ہے کہ خوب عمدہ کھانا دیکھ کر لائے۔

وہ بیان کرتے ہیں کہ یہ سنتے ہی ان میں سے ایک لڑکا بازار دوڑا گیا اور جو کچھ ملا۔ لاکر میرے سامنے اس نے رکھ دیا اور وہ عورت بولی

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِى الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ [۲۹]

اب کھاؤ اور پیو جو تم نے دن گذشتہ میں ہمارے ساتھ سلوک کیا تھا۔ یہ اسی کا بدلہ ہے

عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں کہ میں اس ضعیفہ کی باتیں سن کر اس قدر حیرت میں تھا یہاں تک کہ میں نے لڑکوں سے کہا کہ سنو۔ میں اپنے اوپر تمہارے اس کھانے کو حرام سمجھتا ہوں جب تک تم یہ نہ بیان کرو کہ یہ کون ہے۔ خدا کے بندے۔ اور اس کی داستان کیا ہے من اوّلہ الی آخرہ بیان کرو؛

لڑکوں نے کہا ہم کو بیان کر دینے میں کچھ عذر نہیں ہے یہ ہماری والدہ ہیں۔ چالیس برس ہوئے جب سے سوا قرآن کی آیتوں کے اور کوئی لفظ ان کی زبان سے نہیں نکلا۔ اور انہوں نے اس خوف سے اور باتیں کرنی چھوڑ دیں کہ مبادا کوئی ایسا لفظ زبان سے نہ نکل جائے جس کے سبب سے قیامت کے دن جواب دہی کرنا پڑے۔

عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں میں نے یہ سن کر اس قدر تعجب کیا اور کہا کہ یہ خدا کی مہربانی ہے جس کے حال پر ہو جائے۔ اس قصے سے ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم نے اس عورت میں کس قدر لیاقت پیدا کر دی تھی کہ اپنا ہر کام قرآن ہی سے نکال لیا کرتی تھی۔ اور پھر یہ بھی معلوم

---

[۲۸] سورہ کہف رکوع ۳ — [۲۹] سورہ حاقہ رکوع ۱۔

ہوتا ہے کہ تعلیم نے اس کے دل پر کس قدر پاک اثر پیدا کر دیا تھا اور اس نے کتنا اعلیٰ درجہ اتقاء کا دکھایا کہ اللہ اکبر۔

تتمّت

خاکسار محمد ابوالقاسم ایک بات بتاتا ہے کہ اکثر قافلہ کے پیچھے پیچھے ایک آدمی رہتا ہے تاکہ اگر کسی کی کوئی چیز گری ہو اسے لے کر قافلہ میں دے۔ اگر کوئی چھوٹ گیا ہو اسے قافلہ میں پہنچا دے یہ عبداللہ بن مبارک انہیں میں سے قافلہ کے پیچھے پیچھے تھے فقط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نصیحت ثالثی مقلّدین و محققین

کہاں ہو اے بزرگانِ سلف للہ جی اُٹھو
مسلمانوں کی ہندوستان میں رسوائیاں دیکھو

وہ اس کو مرغ کہتا ہے یہ کوّا اس کو کہتا ہے
عجائب بولیاں کانوں میں آتی ہیں یہاں دیکھو

کوئی بنتا مقلد ہے کوئی غیر مقلد بھی
نہیں معلوم [illegible] فرقے ہیں سب کیسے کہاں دیکھو

وہ جاہل اس کو کہتا ہے یہ احمق اس کو کہتا ہے
پڑھے لکھے مسلمانوں کا انداز بیاں دیکھو

وہابی اس کو وہ کہتا یہ حنفی اس کو کہتا ہے
مہذّب مذہبِ اسلام والوں کی زباں دیکھو

وہ بد مذہب اسے یہ اس کو لامذہب بتاتا ہے
کہاں تک دور ہیں مذہب کے بھی دونوں مہرباں دیکھو

اجی میرے پیارو عقل و مذہب کیا کیا تم نے؟
خدا کے واسطے اپنی یہ بدعنوانیاں دیکھو!

جہاں میں اور بھی قومیں ہیں اور ہر قوم میں فرقے
مگر آپس میں یوں تکرار ہوتی ہے کہاں دیکھو

نہ اس کو اس سے مطلب ہے نہ اس کو ہے غرض اس سے
بس اپنے کام [illegible] دیکھو

نفاق و بغض و بدگوئی و غیبت بھی تم ہی میں ہے
فرشتہ [illegible] اپنی امتحاں دیکھو

یہ کب مذہب کی پابندی یہ اپنی بات کی پچ ہے
مگر انصاف سے [illegible] دیکھو

نبی نے کیا انہیں اخلاق کی تعلیم دی تم کو
تمہارا تو ذرا کچھ تم [illegible] دیکھو

نہایت ہی قوی اک معجزہ تھا خُلقِ پیغمبر
دل [illegible] دیکھو

نہیں ہے [illegible] کو کرتا [illegible]
[illegible] انداز [illegible] دیکھو

سلہ اللؤلؤ والمرجان رسالے کا نام ہے جس میں حضرت [illegible] قرآنیہ سے بات کرنے کی

قطعہ در تعریف از طالب الحسین سیّد محمّد وجاہت حسین عافاہ اللہ تعالیٰ فی الدارین بہاری

فلک کیوں دیکھ کر با صد ہزار اں چشم حیراں ہے — چھپی ہے وہ کتاب انور دل وجاں جس پہ قرباں ہے

عبرت کے مقابلے میں یہی لوءلوءو مرجاں ہے — صحت میں لوح محفوظ اور صفا میں باغ رضواں ہے

کیا کر کہکشاں کو نسخ خطِ نسخ نے اُس کے — تو نستعلیق میں تعلیق روحِ جن والنساں ہے

نقاط اُس کے دُرِ یکتا حروف اس کے کواکب ہیں — سیاہی مشک ہے اس کی سفیدی آبِ حیواں ہے

اس کے مہتمم روشن دل و روشن طبیعت ہیں — کہ ان کے سامنے محجوب ہوتا مہر رخشاں ہے

علومِ شرع میں کامل فنونِ عقل میں ماہر — زمیں بھی چرخ پر ان کے سبب فاخر ہے نازاں ہے

کہا ہے اس طرح تعریف میں اس کے وجاہت نے — کہ لا گر دن میں ڈالیں ہم یہ تعویذ دلِ وجاں ہے

تقریظ از حافظ سیّد محمد عبد الباری سلمہُ اللہ الباری وارد حال بنارس

تمامی ذی علم کو تھا یہ ارمان ! — کہ چھپ جائے کبھی لوءلوءو مرجان

یکایک غیب سے ہاتف نے سب کو — بشارت دی چھپی لوءلوءو مرجان

تقریظ در تالیف از طبع سلیم محمد عبد الرحیم سلمہ اللہ العظیم الہ آبادی

وہ چمکا آج کل اسلام کا نور ! — مٹی جس سے سواد کفر وظلمت

چھپا وہ دفترِ اخلاق تہذیب — ہوئی مد نظر جس سے ہدایت

قرآنِ پاک کا بھی ترجمہ ہے
نہ سمجھیں اس کو بدعت اہلِ بدعت
درِ نایاب ہے اے اہلِ اسلام
مہتمم نے ہے کی اس میں ریاضت
نہیں یہ وقعت ہے اے اہلِ ایمان
مگر ہے شرط تسلیم اس کی قیمت
سمجھ کر جو کوئی اس کو نہ لے
کوئی پھر کیا کرے ہے اسکی غفلت
لکھو عبدالرحیم از روئے انصاف
چھپی ہے یہ کتاب عمدہ نہایت

نتیجۂ افکار احقر کونین فدا حسین مہیش پٹوی دربھنگوی

واہ کیا نسخہ یہ خوش اسلوب ہے
جس کے پڑھنے کے لیے دل بہت مرغوب ہے
لؤلؤ والمرجان نام اسکا ہے رکھا
جو ہر ایک دل میں ہوا محبوب ہے
چیدہ ہیں عبارت آیتِ قرآن کی
پڑھنے والے کے لیے یہ مطلوب ہے
دیکھنے والے یہ کہتے ہیں سدا
فی الحقیقت یہ رسالہ خوب ہے
مہتمم کے حق میں لائق ہے دعا
جن سے یہ نسخہ ہوا مکتوب ہے
چار سو سے آرہی ہے یہ
قطعہ لکھنے کا تو موقع خوب ہے
چار سو سے آرہی ہے یہ صدا
مجھ کو بھی یہ نسخہ ایک مطلوب ہے

از نتائج طبع بلند فکر ارجمند بندۂ ابوسفیان محمد عثمان سلمہ اللہ المنان تراین پوری

چھپا نام خدا بہتر یہ نسخہ
بہت اچھا بہت عمدہ بہت خوب
بیان کیفیت گر مجھ سے ممنوع
تو حصر بے حدی کا غذ سے مسلوب

سواد اس کا، سواد دیدۂ حور	بیاض اس کا بیاضِ چشمِ یعقوب
سطور اس کے ہیں انہار مسلسل	نقاط اس کے ہیں دُرِ بحرِ مطلوب
پوچھا عثمان نے جب اِسکی تعریف	کہا قائل نے کیسے واہ مرغوب

قطعۂ تاریخ کمترین محمد صدیق طالب العلم عفا اللہ عنہ اُموی مظفرپوری

ہوا جب طبع یہ رسالہ عجیب	مضامین جس کے ہیں نادر غریب
لکھوں کیا مدح اس کے مشموں کی	بھر جا ہو معروف مثل نقیب
رسالہ یہ عبرت سے آمیز ہے	دے توفیق سب کو خدائے مجیب
دعا گو بدل مہتمم کے ہیں ہم	چھپا خوب واللہ نسخہ عجیب
مدرسہ ہے تعطیل صدیق آج	ہوا جس سے لکھنے کا موقع نصیب
دعا ہے خدا سے ہمیں دمبدم	ہو مقبول سب کو بعید و قریب

تمت